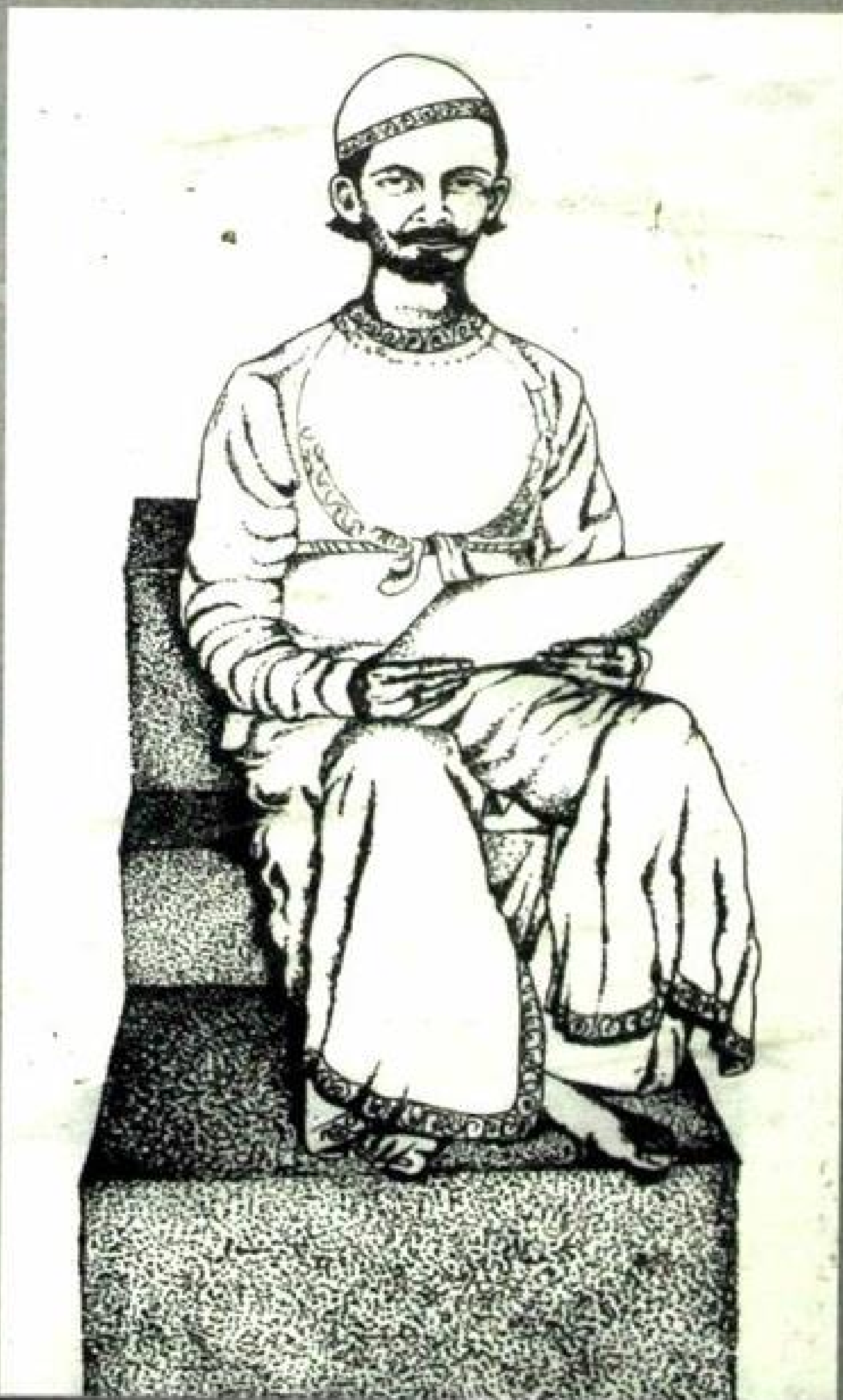
کتاب نما خصوصی شمارہ

انیس نمبر

کتاب نما



۱۸۰۳ء ـ ۱۸۷۴ء

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

کتاب نما کا خصوصی شمارہ

میر ببر علی انیس

'یا انیس من لا انیس لہٗ'

مرتّب:

غلام حیدر

معاون:

مولانا ذوالقدر رضوی

ماھنامہ 'کتاب نما'، جامعہ نگر، نئی دھلی۔۲۵

اڈیٹر : شاہد علی خاں

ترتیب : غلام حیدر

معاون : مولانا ذوالقدر رضوی

اس شمارے کی قیمت :-/180 روپے

تقسیم کار:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 فون نمبر:26910191

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی۔110006 فون نمبر:23260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003 فون نمبر:23774857

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202001 فون نمبر:2706142

پہلی بار: دسمبر ۲۰۰۲ء تعداد:500 قیمت: -/180 روپے

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی۔

ترتیب

تبرکاتِ رفتگاں

نظم

منظوم خراجِ عقیدت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

'کتاب نما' جسے آج کی اردو دنیا میں ہم ایک معتبر 'ادب نما' کہہ سکتے ہیں، اس کے کسی شمارے، اور وہ بھی میر ببر علی انیسؔ جیسے عظیم المرتبت مالکِ ملکِ شعر و سخن سے منسوب خصوصی شمارے کی ترتیب و تدوین کا کام مجھ جیسے کم علم کو سونپا گیا، اس پر میں خود حیران ہوں، اگر علامہ عقیل الغروی صاحب جو بیک وقت میرے ایک عزیز خورد، ادبی دوست اور دینی عالم ہیں، مجھے حکم نہ دیتے اور میری بھرپور ہدایت اور استعانت کا وعدہ نہ کرتے تو میں جو خود کو 'بچوں کا ادیب' کہتے ہوئے بھی تذبذب محسوس کرتا ہوں، اس ذمے داری کو ہرگز قبول نہ کرتا۔ بہر صورت، جو کچھ میں اپنی بے بضاعتی کے باوجود مولانا موصوف اور دوسرے معاونین کی مدد سے جمع کر کے پیش کر سکا وہ قارئین کے پیشِ نظر ہے۔ مجھے احساس ہے کہ اگر میں اپنی ادب فہمی اور نکتہ سنجی کا دعویٰ بھی کرتا، تب بھی انیسؔ جیسی قدآور شخصیت کو کماحقہٗ خراج عقیدت پیش کرنا میرے بس میں نہ ہوتا۔ خیر، ع: 'اتنی بھی آگہی بہت ہے میاں!'

جب پیشِ نظر مضامین اور دیگر مواد جمع ہو گئے اور ان کا ابتدائی طباعتی کام پورا ہونے کو آیا تو یاد آیا کہ مرتب پر 'ڈاکیہ' کی ذمہ داری پوری کرنے سے آگے بھی کچھ فرض عائد ہوتا ہے — یعنی اپنی طرف سے بھی کچھ شامل کرنا۔ اس سلسلے میں صرف اپنی بے بضاعتی ہی حائل نظر نہ آئی بلکہ احساس ہوا کہ باقاعدہ طور پر اردو ادب کا طالب علم نہ ہوتے ہوئے، میر انیسؔ یا صنف مرثیہ کے سلسلے میں جو کچھ میں کہہ بھی سکتا تھا لگ بھگ وہ سب کچھ جن ارباب قلم، ناقدین، مبصرین اور شعراء کی کاوشیں اس شمارے میں شامل ہو رہی ہیں، انھوں نے مجھ سے بہتر انداز میں کہہ دیا ہے، چنانچہ اب ع: 'یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں'

جہاں تک یاد پڑتا ہے سب سے پہلے اشعار، جو میں نے کسی سے سن کر یاد کیے ہوں گے، وہ میر انیسؔ کی رُباعیاں اور سلام ہی ہوں گے، کیونکہ میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی اس میں بقولِ جمیلؔ مظہری ع: 'مرثیے میں نے سنے گود میں لوری کی طرح' اور اپنی فطرتِ خود نمائی کی تسکین اور خود اعتمادی کی تربیت کے لیے، یا ممکن ہے خالص اعتقادی جذبے کے تحت مجھے مجالس عزا میں پیش خوانی کے طور پر بہت چھوٹی عمر سے رباعیاں اور سلام پڑھنے کا موقع حاصل ہوا۔ شکر ہے کہ اس بنیادی تربیت نے مجھے شعر وسخن کا ذوق اور ایسا ذہنی سہارا فراہم کر دیا جس نے اور کچھ دیا ہو یا نہ دیا ہو، زندگی کے اتار چڑھاؤ، نرم گرم اور خشک وتر سے کسی قدر سکون سے گزرنے میں میری ہمیشہ بہت مدد کی۔

ہمارے اس گنگا جمنی کلچر پر، جو ایک عرصے تک خصوصاً شمالی ہندوستان اور عمومی طور پر پورے برّ صغیر کا طرۂ امتیاز تھا اور جس میں بدقسمتی سے اب ہر طرح کی فرقہ واریت، عصبیت اور منافرت کا زہر بہت حد تک سرایت کر چکا ہے، مرثیے کا کتنا گہرا اثر رہا ہے اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ یقیناً برّ صغیر میں مرثیے سے کہیں زیادہ غزل مقبول ہوئی۔ مگر صنفِ غزل شروع سے ہی، مرثیے کے مقابلے میں کہیں زیادہ سیکولر یا بلا تفریقِ مذہب ومسلک عام قاری کے جذبات واحساسات کو متوجہ کرنے والی صنف تھی۔ کلاسیکی دور میں غزل نے تصوف یا کچھ فلسفیانہ مضامین اور کسی حد تک خیر وشر کے تضاد کے اظہار کو ضرور اپنایا اور اس کے بعد ترقی پسند اور صاحب شعور شعراء نے عام زندگی کے مسائل، تناؤ، تشنگیوں اور محرومیوں کا ذکر کرنا قبول کیا جس سے یہ عوام کے اور قریب آ گئی لیکن کسی دور میں بھی اس کی بنیاد کسی مذہب، مسلک، طرزِ فکر وغیرہ پر نہیں رہی، اس لیے اس کے مقبولِ عام ہونے اور کلچر پر اثر انداز ہونے میں کوئی خاص رکاوٹ ہی نہ تھی۔

دوسری طرف مرثیہ، خالص لغوی معنوں سے قطع نظر، خصوصاً ہندوستان میں ایک مذہب اور اس میں بھی ایک مخصوص مسلک سے تعلق رکھتا تھا۔ یقیناً، کچھ عرصے تک اس کی خالص یہی حیثیت رہی بھی، لیکن جس دن سے سریو ندی اور گومتی کے کناروں کی زرخیز دھرتی میں ابھرتی ہوئی مایۂ ناز گنگا جمنی تہذیب نے اسے اپنایا، میر خلیقؔ، میر انیسؔ،

مرزا دبیر اور دوسرے اساتذہ نے اس کے خاکوں میں نئے نئے رنگ بھرنے شروع کیے، خواص و عوام نے اسے ایسے گلے لگایا کہ یہ ان کے کلچر کا ایک جزو لاثانی بن گیا۔ (اس شمارے میں لندن کے ایک اسکالر ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز کے مضمون کا ابتدائی حصہ اس کا شاہد ہے)۔ ہمارا آج کا عام اردو خواں طبقہ، پچھلی نصف صدی میں، زمانے کے عجیب و غریب انقلاب کے اثر میں، اب ممکن ہے اپنے کلچر پر اس اثر کو پوری طرح محسوس نہ کر سکتا ہو لیکن پچھلی دو تین نسلوں میں یہ بہت ممتاز انداز میں نظر آیا۔ میں مختصراً اس کی دو تین مثالیں دینا چاہتا ہوں۔

ضروری نہیں کہ میر انیس اور مرزا دبیر اور دوسرے اساتذہ کے مرثیوں میں نظر آنے والے تمام عقائد اور ان کے اظہارات سے مولانا حالی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا عبدالسلام ندوی اور دوسرے بہت سے نقاد پوری طرح متفق رہے ہوں، مگر صنفِ مرثیہ کو ان اساتذہ کی بخشی ہوئی غیر معمولی شعری توانائی اور ان کی ادبی قدر و منزلت کچھ ایسی ہی تھی کہ ان علماء کی سنجیدہ تحریروں نے مرثیے کو ان عام لوگوں کے ذہنوں میں بھی مقتدر اور محترم کر دیا جو اب تک اسے صرف ایک مخصوص مسلک کے کچھ عقائد کے شدت آمیز اظہارات سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے تھے۔

اس ادبی انقلاب میں تینوں عوامل غالباً یکساں توانائی سے اثر انداز ہوئے ——— واقعۂ کربلا کی حقانیت اور اس کی اقدار میں عوام کے لیے بے حد پُرکشش مواد، ان اساتذۂ فن، خصوصاً میر انیس جیسے عظیم شاعر کی بے مثال فنکاری اور ادبی صلاحیت، اور اس ملک کے عوام کے خمیر میں رواداری اور حق پسندی کا ایک نادر جذبہ۔ جس کے کچھ نمونے مختصراً آپ آگے ملاحظہ فرمائیں گے۔ (اسی شمارے میں پروفیسر اطہر رضا بلگرامی کے ایک مضمون میں اس پر زیادہ واضح گفتگو کی گئی ہے)۔ بہر طور، نتیجہ یہ ہوا کہ صرف پچھلے چند دہوں کو چھوڑ کر، جس میں سیاسی، سماجی، صنعتی، تہذیبی اور خدا جانے کس کس طرح کے انقلابات رونما ہوئے اور برابر ہو رہے ہیں، مرثیے کی عوامی مقبولیت بڑھتی ہی گئی، اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس متواتر اضافے میں اردو کے سب سے اہم شاعر میر انیس کا حصہ سب سے زیادہ نظر آتا ہے۔

بالکل نو آباد دہلی کے ایک ایسے علاقے (پٹیل نگر) میں جہاں اردو کا نہ کوئی چرچا نہ اردو کلچر کا کوئی اثر، اب سے کوئی پچیس برس پہلے، اردو میں چھپے ایک پوسٹر پر نگاہ پڑی جس کی سرخی تھی ع : 'کس شیر کی آمد ہے کہ رَن کانپ رہا ہے' اور میرے ذہن نے مرزا دبیر کا یہ معرکتہ الآراء بند سہو کی دھول سے نکال کر جھاڑ پونچھ کر صفحۂ شعور پر دوبارہ مرتسم کر دیا

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے — رستم کا جگر زیرِ کفن کانپ رہا ہے

ہر قصرِ سلاطینِ زمن کانپ رہا ہے — سب ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے

شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو

جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

پورا پوسٹر پڑھنے کے بعد علم ہوا کہ یہ شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کی دہلی شاخ کے الیکشن میں جو صاحب کھڑے ہوئے تھے، ان کی حمایت میں چسپاں کیا گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ پچھلی دو تین صدیوں اور خصوصاً پچھلی صدی کے آخری نصف حصے میں تاریخ کے تمام تر سرد و گرم، تلخیوں اور انقلابات کے باوجود مرثیے کا یہ کلچرل اثر کتنا گہرا ہے۔ ممکن ہے اس پوسٹر کا مرتّب اس پورے بند کے آہنگ سے بھی واقف ہو، کیونکہ پچھلی نسل میں پنجابی حضرات اردو کلچر سے نہ صرف قریب تھے بلکہ اس کے ایک 'اسکول' کا حصہ مانے جاتے تھے۔

بچپن میں جب میں :۔

''ان کو مجرا شام تک نیزوں پہ جن کے سر گئے — زندۂ جاوید ہیں، ظاہر میں گو وہ مر گئے

ایک سائل کو علی نے بخشی اونٹوں کی قطار — شام تک بن کر شتر باں عابدِ مضطر گئے

اور پھر

زندگی کا اپنی ہے دلگیر گر رشتہ قوی — تو یہ سن لینا کہ تم آقا کے روضے پر گئے''

سنتا تھا تو سلام کے ان اشعار کو فرقۂ جعفری کے کسی بے حد عقیدت مند شاعر کا کلام سمجھتا تھا لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ دلگیر کا نام چھنو لال تھا اور مذہباً وہ ہندو تھے تب مجھے یہ احساس ہوا کہ واقعۂ کربلا اور ہندوستانی مرثیے نے ہمارے کلچر پر کتنا گہرا اثر چھوڑا تھا۔

ذرا مندرجہ ذیل چند اشعار پر غور کیجئے:

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال　　خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال　　سکتا سا ہو گیا ہے یہ ہے شدتِ ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ　　نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ　　لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رُخ کی راہ
چہرے کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

سُن کر زباں سے ماں کی یہ فریادِ درد خیز　　اس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز
عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز　　لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز
سوچا یہی کہ جان سے بیکس گزر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

اور دوسری طرف:

قدموں پہ ماں کے جھک گیا بڑھ کر وہ نونہال　　رُخ کی بلائیں لے کے یہ بولی وہ خوش خصال
کیا کچھ خفا ہو تم مری باتوں سے میرے لال　　..
صدقہ یہ آپ کا ہے کہ عالی مقام ہوں
خادم ہوں جاں نثار ہوں ادنیٰ غلام ہوں

ہاتھوں سے دل کو تھام کے بولی وہ سوگوار　　میں صدقے تم پہ اور مرے ماں باپ بھی نثار
کیا دودھ ایسی چیز ہے بخشا ہزار بار　　ماں کو دعائیں دے کے یہ بولا وہ ذی وقار
اب دل سے دور رنج و غم و درد ہو گیا
تر ہو گئی زبان جگر سرد ہو گیا

....　　..

---

۱ نتھونی لال وحشی، متوفی ۱۹۵۰ء، شاگردِ جناب خورشید حسن (جو علامہ جمیل مظہری کے والد بزرگوار تھے)، وطن حاجی پور، بہار، مرثیہ فکر رسا مرتب، جابر حسین (۱۹۹۶) ناشر، بہار فاؤنڈیشن، لوہیا نگر، پٹنہ۔

ماں آتما کی آنچ سے ہوئے گی بے قرار　　تو صبر کر عطا انھیں اے میرے کردگار

فرقت ہے اس کی تلخ جو فرزند اہل ہو

ہاں تو مدد کرے تو یہ مشکل بھی سہل ہو

کسی ایسے شخص کو جو ہندوستان کی اس ملی جلی تہذیب کے نقوش سے واقف نہ ہو یہ بند سنائیے تو وہ یہی سمجھے گا کہ یہ کسی ایک صورتِ حال (سچویشن) کا ذکر ہے اور کسی ایک ہی شخص کے ماں سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہونے کا منظر ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سچویشن میں ہزاروں برس کا بعد زمانی اور اتنا ہی بعد مکانی ہے۔ پہلے تین بندوں میں پنڈت برج نرائن چکبست نے رام چندر جی کے بن باس سدھارتے ہوئے اپنی ماتا جی سے 'آگیا' لیتے وقت کا منظر پیش کیا ہے اور مؤخرالذکر بندوں میں حضرت علی اکبر کی اپنی والدۂ ماجدہ سے رن کو سدھارنے کی اجازت حاصل کرتے وقت میر انیسؔ کی منظر کشی ہے۔

اور ذرا مندرجہ ذیل چند بندوں میں عقیدت، جذبے، اور عشق حقیقی سے سرشار ذوق کو ملاحظہ فرمائیے:

گیسو طرازِ لیلیٰ معنی ہے فن مرا　　فطرت نے موتیوں سے بھرا ہے دہن مرا

ہے سیر گاہِ بلبلِ سدرہ چمن مرا　　دریائے معرفت کا ہے دھارا سخن مرا

مداح ہوں ولائے خدائے قدیر کا

کوثر کا رُخ کیے ہے سفینہ فقیر کا

سوئے نجف رواں ہوا نکلا حرم سے جب　　ساغر بدوش و خامہ بگوش و ثنا بہ لب

وردِ زباں کہ یا شہِ دیں خسروِ عرب　　اسلام وکفر دونوں سے جی ہے اچاٹ اب

نیت بندھی ہے دُور سے احرام عشق کی

مٹی قبول وحشیِ بدنامِ عشق کی

ہوں تشنہ کامِ معرفتِ عشق کبریا　　پینے سے مجھ کو کام ہے پنگھٹ ہیں جا بجا

بطحا و طوس و کاشی و پریاگ بندھیا　　متھرا و کاظمین و جگر ناتھ و کربلا

اللہ رے تشنگی مرے ذوقِ صفات کی

گنگا سے ہمکنار میں موجیں فرات کی

ساقی جگر ہے خون، ہٹا شیشہ و شراب ہے نام سے فرات کے یوں دل کو اضطراب
جس طرح ہو فرات میں موجوں کا پیچ و تاب یاد آ گیا وہ وادیِ غربت وہ قحطِ آب

ان سالکانِ راہِ خدا پر خودی نثار
اس تشنگی پہ روح کی ہر تشنگی نثار

اے چرخ اپنی گردشِ لیل و نہار دیکھ ہے خیر و شر میں معرکۂ گیر و دار دیکھ
پیاسا ہے تین روز سے ایک شیر خوار دیکھ ڈالے ہے سر پہ خاک سیہ روزگار دیکھ

دیکھ اپنی کج روی کا تماشا بھی دیکھ لے
کوثر لٹانے والے کو پیاسا بھی دیکھ لے [1]

اتر پردیش، بہار، بنگال، اور حیدر آباد، مرشد آباد اور کلکتہ غرض جہاں جہاں مرثیہ خوانی کی فضا تھی وہاں کے قصبات میں بے شمار ایسے لوگ دیکھنے اور سننے کو مل جاتے تھے، اور شاذ و نادر اب بھی کہیں کہیں موجود ہیں، جنھیں نہ جانے کتنے مرثیے، سلام، رباعیاں حفظ تھے، جن کا تلفظ، وزن، طرز ادا سب درست تھے جبکہ وہ سو فیصدی ناخواندہ تھے۔ ان میں بھی میر انیسؔ کے کلام کے حافظ بہت زیادہ تھے، سوائے پنجاب کے علاقے کے، کہ وہاں بیشتر مرزا دبیرؔ کے کلام کا سحرِ حلال کام کر رہا تھا۔ کیا اسے ہندوستانی کلچر پر مرثیے کا سحر نہیں مانا جائے گا۔

شعر و سخن کی اس صنف کو اعلیٰ ترین مقام تک پہنچانے والے میر ببر علی انیسؔ کو سو دو سو صفحات میں یا چند مضامین اور نظموں سے خراجِ عقیدت پیش کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ پھر بھی یہ سلسلہ لگ بھگ ایک صدی سے جاری ہے اور ہم اس نمبر کے ذریعے انیسؔ کے دوسرے صدی سال کی ابتدا کر رہے ہیں، ہمارے لیے یہ بھی ایک خوش نصیبی اور باعث افتخار بات ہے۔

اپنے محدود ذرائع میں ہم نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ متقدمین، متوسطین اور متاخرین اور جدید لکھنے والوں کے مضامین، نظموں، اقتباسات، اظہارات وغیرہ کے ذریعے انیسؔ کی غیر معمولی مقبولیت پر کچھ روشنی پڑ جائے اور آج کے قاری کو یہ احساس ہو جائے کہ پچھلی ایک صدی میں کیسے کیسے ماہرین فن ناقدین، شعراء، ادباء نے انیس کو کس کس طرح یاد کیا ہے اور انھیں اردو شعر و ادب کا بے مثال مظہر بنایا ہے۔ انھیں میں کہیں کہیں انیسؔ پر کسی قدر تیکھی تنقید کے نقوش بھی نظر آ جائیں گے۔ اس میں ان کے کلام سے محظوظ ہونے والے لاکھوں کروڑوں سامعین، قارئین، ذاکرین، سوز

خوانوں، تحت خانوں اور مجالس عزا میں عام طور پر شرکت کرنے والے شائقین کا خراجِ تحسین و عقیدت شامل نہیں ہے جو ایک صدی سے زیادہ ان کے کلام کو پڑھتے اور سنتے رہے ہیں۔ اس کا کچھ اندازہ اس شمارے میں شامل چند مضامین میں متفرق ٹکڑوں سے اور تنویر الحسن صاحب کے تحت خوانی پر ایک مختصر مضمون سے لگایا جا سکتا ہے۔

لندن یونیورسٹی میں اردو کے استاد ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز کے مضمون 'اردو ادب میں انیسؔ کا مقام' سے کسی حد تک یہ اندازہ ہوگا کہ اگر انیسؔ کا کلام مغربی دنیا میں پوری طرح پہنچ سکے تو اس کی کیا قدر و منزلت ہوگی۔ انیسؔ کی نعت نگاری اور غزل گوئی پر بھی دو مضامین شامل ہیں اور یہ وہ گوشے ہیں جن پر کم توجہ دی گئی ہے۔ علامہ عقیل الغروی، جو اجتہاد کی تمام اعلیٰ منزلوں کو طے کر چکنے کے ساتھ ادبی میدان میں بھی غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل ہیں، انھوں نے اپنے مضمون 'میر انیس اور علامہ جمیل مظہری' میں انیسؔ کی پیدا کردہ تخلیقی فضا کو 'چہار بُعدی' کہا ہے ــــ بُعد زبانی، بُعد مضمون آفرینی، بُعدِ قدرتِ بیان اور بُعدِ عشقِ موضوع ــــ جن سے انیسؔ کے تخلیقی عوامل پر بہت قابلِ قدر روشنی پڑتی ہے۔

جناب خیرات احمد صاحب کے لگ بھگ ستر اسی سال قبل شائع ہوئے ایک طویل مضمون کے کچھ اقتباسات اس لیے شامل کیے گئے ہیں کہ انھوں نے انیسؔ کے کلام کی ادبی خوبیوں کو بھی خالص 'روحانی اور الٰہیاتی' نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ نقادانِ انیسؔ کے عنوان سے پاکستان کے سید تمقام حسین جعفری کا مضمون شامل کیا جا رہا ہے جو وہاں انیس صدی کے موقعے پر شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کو اس لیے شامل کیا گیا ہے کہ ان کے توسط سے متعدد ناقدانِ انیسؔ کی آراء بیک نگاہ دیکھی جا سکتی ہیں۔ میر انیسؔ کے معرکۃ الآراء مرثیے ع: جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے' کا ترجمہ انگریزی میں جناب ڈیوڈ میتھیوز نے کیا ہے اور دوسرا مرثیہ: ع 'یارب چمنِ نظم کو گلزارِ اِرم کر' کا ترجمہ پاکستان میں سید غلام عباس صاحب نے کیا تھا۔ ان تراجم پر تبصرہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں انگریزی کے (سبکدوش) استاد جناب رضا امام صاحب نے کیا ہے، اسے بھی شامل کیا جا رہا ہے۔

ہمارے بزرگ، انیس شناس اور دنیائے اردو کی دو مانی ہوئی ہستیاں، جناب نیر مسعود اور جناب علی جواد زیدی اپنی صحت اور پیرانہ سالی کے باعث اس شمارے میں پورے طور پر

قلمی تعاون نہ دے سکے، جس کا ہمیں افسوس ہے، بہرطور ان کی دعاؤں اور نیک خواہشات کو ان کے تحریر کردہ پیغامات کی شکل میں شمارے میں شامل کیا گیا ہے۔ تبرکاً نیر مسعود صاحب کا ارسال کردہ میر انس کا ایک سلام جس پر میر انیس کی اصلاح ہے، اور اب تک غیر مطبوعہ ہے، اسے بھی شامل کیا گیا ہے۔ منظوم خراج عقیدت بھی کسی طرح کم قابلِ قدر نہیں ہے۔ انیس کے اپنے کلام کے نمونے کے لیے ہم نے کسی مشہور و معروف مرثیے کو اس لیے منتخب نہیں کیا کہ اس سے قارئین اور سامعین بخوبی آشنا ہیں۔ مرثیہ: 'جس دم نماز صبح ادا کی حسین نے' جو شہاب سرمدی مرحوم کی تحقیق کے مطابق انیس کے قیامِ فیض آباد، یعنی ابتدائی دور کی تصنیف ہے اس کے منتخب بند اس لیے شامل کیے گئے ہیں کہ اس میں انیس کی مرثیہ گوئی اور خود انیس بحیثیت مرثیہ گو، ترقی کی منزلوں میں نظر آتے ہیں، لیکن ان بندوں سے بھی آنے والے وقت میں ان کے عروج کے نقوش کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جیسا میں نے پہلے عرض کیا مجھے پورا احساس ہے کہ مختلف قسم کے وسائل کی قلت، خصوصاً وقت اور انسانی وسائل کی کمی کے باعث ہم اتنے عظیم کام کا پورا پورا حق تو ادا نہ کر سکے، مگر اپنی بساط بھر یہ کوشش ضرور کی ہے کہ اس بے مثال اور عظیم شاعر کے کلام، فن، شخصیت اور اس کے مختلف گوشوں پر آج کی دنیا والوں کے لیے گزشتہ اور موجودہ کچھ مواد فراہم ہو جائے۔ ہماری ناچیز کوشش آپ کے پیشِ نظر ہے۔

میں اس طباعت کے سلسلے میں ذاتی طور پر سب سے پہلے مکتبہ جامعہ اور اپنے پرانے دوست اور کرم فرما شاہد علی خاں صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے نہ صرف ہماری ہمت افزائی کی بلکہ ہماری ہر بات مان لی۔ سفینۃ الہدایہ ٹرسٹ، دہلی، جس کی تمام تر کاوشوں سے برطانیہ اور ہندوستان میں انیس پر مختلف تقریبات اور اشاعتوں کا سلسلہ شروع ہوا، یہ خیال عملی جامہ پہن سکا، اس کے بانی اور فعال سربراہ حجۃ الاسلام ذیشان ہدایتی اور ڈاکٹر ظفر احسن زیدی (لندن) کا میں ذاتی طور پر ان کی ہدایات اور بے محابا تعاون کے لیے ممنون ہوں۔ ویسے یہ شمارہ اسی ادارے کی تحریک اور عملی تعاون سے پیش کیا جا رہا ہے۔ جناب غضنفر زیدی جنھوں نے اس شمارے کا اتنا مناسب اور دیدہ زیب ٹائٹل تیار کیا اور

ان کے ساتھیوں کا جنھوں نے اس کی بصری تزئین میں تعاون دیا بے حد شکر گزار ہوں۔ تمام ان ادیبوں، نقادوں اور شعراء کا، جن میں آج کے دور کے اور پچھلے زمانے کے ممتاز افراد بھی شامل ہیں، اور جن کے تعاون سے یہ خصوصی شمارہ مرتب ہو سکا سراپا ممنون ہوں۔ ان اداروں، رسائل اور کتب اور ان کے ادیبوں اور ناشروں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن سے ہم نے کچھ مضامین، نظمیں اور اقتباسات اخذ کیے ہیں۔ آخر میں حضرت رب العزت سے دعا کرتا ہوں کہ بارگاہ ادب میں ہماری یہ کوشش مقبول ہو۔

غلام حیدر، نئی دہلی

دسمبر ۲۰۰۲ء



شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالیؔ

اردو! گو راج چار سو تیرا ہے
شہروں میں رواج کو بکو تیرا ہے
پر جب تک انیسؔ کا سحر ہے باقی
تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے

پدم شری علی جواد زیدی
(لکھنؤ)

مکرمی غلام حیدر صاحب، سلام مسنون

آج کل ضعف اور پیری نے مجھے خانہ نشین بنا دیا ہے تو وہاں حاضری سے قاصر ہوں۔ میری طرف سے علامہ غروی صاحب کی خدمت میں معذرت کر دیجیے گا اور عنایت کا شکریہ کہ انھوں نے یاد کیا۔ ایک پیغام ساتھ جا رہا ہے۔ قبول کیجیے۔ والسلام

مخلص

علی جواد زیدی

پیغام

جب سے میر انیس کی دوسری صدی قریب آنے لگی میرے دل میں انہی کے یہ دو شعر گونجنے لگے:

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر مگر میں نے پلّا گراں کر دیا
مری قدر کر اے زمینِ سخن تجھے خاک سے آسماں کر دیا

لیکن ان کے مَولد و مدفن میں ابھی تک حرکت کے آثار (ہیں) شاید ان کی روح میر کی لَے میں گنگنا رہی ہو:

پتّا پتّا بوٗٹا بوٗٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

مگر میرا یہ خوف بیجا تھا۔ ان کے مَولد و مدفن دونوں ہی جگہ یعنی لکھنؤ اور دہلی میں اچھے پیمانے پر تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔

دنیائے ادب میں میر انیس کی شخصیت اور فن ایک روشن مینار کی حیثیت سے عالمی اہمیت کی

حامل تسلیم کر لی گئی ہے۔ صنفِ مرثیہ میں وہ ایک نئی راہ کے رہنما تو تھے ہی اردو ادب میں بحیثیت مجموعی انھوں نے مسدس کو غزل اور قصیدے کی محدود فضا سے باہر نکال کر مسدس میں فکری ثقافتی عناصر کے لیے ایک نیا لہجہ اور نیا اندازِ فکر عطا کیا۔ نئی نظم کے رہبروں میں اقبالؔ و چکبستؔ کے مسدس کو ایسی جاذبیت و جامعیت عطا کی کہ مسدس ترقی پسند احساسات کا ایک خوش آہنگ طرزِ اظہار بن گیا۔ اخلاقیات اور مذہبیات کے میدان میں بھی انھوں نے نئی بیداری کے امکانات روشن کیے، اور ایک محدود دائرے سے نکل کر اس لہجے کو ایسی ہمہ گیری عطا کی جس کی گونج دوسری زبانوں تک پہنچی۔ نہایت خاموشی سے انگریزی میں بھی انیسؔ کے اقتباسات کی جھلک ترجموں کی شکل میں دیکھی جانے لگی ہے۔ امیر امام حُر اور ڈیوڈ میتھیوز نے ان کے پورے پورے مرثیوں کا ترجمہ کر ڈالا قرۃ العین حیدر نے میری تصنیف History of Urdu Literature کے لیے انیس کے کافی اکتسابات کا ترجمہ کیا ہے۔ میں نے شکریے کے ساتھ اس میں شائع بھی کر دیا ہے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے ٹورنٹو میں انیسؔ کے ایک پورے مرثیے کا تجزیہ و ترجمہ کر ڈالا ہے۔ بہت سال پہلے سید غلام امام ایڈوکیٹ نے انیسؔ اور شیکسپیئر کے یہاں متوازی مقامات کا انگریزی میں ترجمہ پیش کیا تھا، میں نے انیسؔ کی شخصیت اور شاعری پر ہندوستانی اکیڈمی کے لیے ایک (مونوگراف) تحریر کیا تھا جو شائع ہو کر کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان چند نمونوں کے علاوہ اور بھی انگریزی تراجم اور مطالعے وجود میں آچکے ہیں۔ امید ہے کہ آپ کے سیمنار میں انیسؔ پر اور زیادہ تفصیلی اور جامع مقالے پیش کیے جائیں گے۔ اس اعتبار سے آپ کا یہ سیمنار بھی ایک یادگار بن جائے گا۔

شہر دہلی میں آپ جن حضرات سے خصوصیت سے تعاون حاصل کرنا چاہیں گے ان میں شاہد مہدی صاحب وائس چانسلر جامعہ ملیہ دہلی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا تعاون ضرور حاصل کریں اور اس طرح سیمنار کو دوسری صدی کی تقریبات میں ایک یادگار حیثیت دلائیں۔ تحت اللفظ اور سوز خوانی کا ذکر آپ کے پروگرام میں کیا گیا ہے یہ ایک تعمیری حیثیت رکھتا ہے اور میں آپ کی تمام تقریبات کی کامیابی کو انیسؔ شناسی کا اہم موڑ سمجھوں گا۔ یقین ہے کہ انیسؔ شناسی میں آپ کی تقریبات ایک نیا سنگِ میل ثابت ہوں گی۔ کامیابی کی دعاؤں کے ساتھ

مخلص علی جواد زیدی

نیر مسعود
(لکھنؤ)

پیغام

یہ خبر بہت خوش کن ہے کہ سفینۃ الہدایہ ٹرسٹ اور کلچرل کمیٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ مل کر میر انیسؔ کی دو صد سالہ یادگار کے موقعے پر ایک ادبی سیمنار، مسالمے، سوز وتحت خوانی کا اہتمام کرر ہے ہیں۔ ۲۰۰۳ء انیسؔ کی دوسری صدی کا سال ہے اور اس سال کے آغاز ہی میں اس تقریب کا انعقاد نیک شگون ہے۔ انیس کے فن پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن ابھی اس سے بہت زیادہ لکھنا باقی ہے۔ امید ہے کہ سیمنار کے مقالوں میں انیسؔ کی شاعری کے بہت سے گوشوں پر نئی روشنی پڑے گی۔

میری دلی خواہش تھی کہ اس سیمنار میں شرکت کرتا اور اس میں پڑھے جانے والے مقالوں سے مستفید ہوتا لیکن فالج کے سبب معذور ہو چکا ہوں۔ فی الحال ایسا کچھ لکھ بھی نہیں سکتا جو انیسؔ کے سے شاعر کی شان کے شایاں ہو ورنہ کتاب نما کے خصوصی مجلّے کے لیے کچھ لکھتا۔

میری دعا ہے کہ یہ تقریب کامیاب اور مجلّہ مقبول ہو۔

نیر مسعود

عمر انصاری

نذرِ انیسؔ

رباعیات

نقشِ کفِ بو تراب ہو جاتا ہے
ہر آنکھ میں باریاب ہو جاتا ہے
چھو کر جو نکل جائے ذرا کلکِ انیسؔ
نقطہ بھی وہ آفتاب ہو جاتا ہے

گنجینۂ افکار و معانی ہیں انیسؔ
کوثر ہیں انیسؔ اس کی روانی ہیں انیسؔ
کہتی ہی رہے گی جس کو دنیا تا حشر
دنیائے ادب کی وہ کہانی ہیں انیسؔ

صفی حسن (برمنگھم، یو۔ کے۔)

انیسؔ رحمۃ اللہ علیہ

وہ آسماں کی کھُلی فضاؤں کا اِک ستارہ
جو زندگی کا شعور پہنے
محبتوں کے سفر پہ نکلا
تو ایک پل کو زمیں پہ ٹھہرا
عجیب رونق تھی اس کی آنکھوں میں
اس کی باتوں میں
اس کے دل میں
کہ استعارہ تھا روشنی کا
اُداس راتوں میں جب کبھی اس نے لمحہ بھر کو نظر اٹھائی
تو چاندنی اس کی گھر کی دہلیز تک اپنی آنکھیں بچھاتی آئی
سحر کی تصویر کھینچتا تو
غُبارِ شب میں اُفق پہ سورج اُبھرنے لگتا
کبھی جو کاغذ پہ اپنے ہاتھوں سے
اُس نے ہونٹوں کی پیاس لکھی
تو ہر سطر پر بول اپنی زبانیں کھولے سسک رہے تھے
کہ وہ مصور تھا زندگی کا
نہ جانے کتنے ہی نقش اُس کے دریچۂ فکر میں نہاں تھے
وہ اپنے ہاتھوں چمکتے خنجر میں حُسنِ یوسف کی ساری رعنائیاں سجا کر
ہوا کو رہوار کے تعاقب میں بھیجتا تھا

وہ لکھ رہا تھا۔
کہ صابروں کے کسی قبیلے کی جنگ کیا ہے
نڈھال جسموں کے عزمِ آہن سے دُشمنوں کے دہکتے نیزے
اُلجھ کے کیسے بجھے ہوئے ہیں
یقیں کے لمحے
گُماں کی سرحد پہ کس طرح پھول بن کر کھلے ہوئے ہیں
وہ ننھے منے بلکتے بچّوں کے بے زباں آنسوؤں سے خفتہ
ضمیرِ انسانیت کو بیدار کر رہا تھا
شُجر شُجر کو خزاں کے گھر میں
خزاں سے بیزار کر رہا تھا
کہ داستانِ غمِ محبت کو لکھتے لکھتے
وہ خود بھی کرب و بلا کے بَن میں
لہو کی تصویر ہو گیا تھا
وفا کی تعبیر ہو گیا تھا

ڈیوڈ میتھیوز
(لندن)

اردو ادب میں میر انیسؔ کا مقام

بیسویں صدی میں اردو ادب پر لکھے جانے والے چند ایک تذکروں میں صنف مرثیہ اور اردو کے جلیل القدر مرثیہ گو شاعر میر انیسؔ کو نہ صرف ایک معمولی سا مقام دیا گیا بلکہ ان کے ساتھ کھلے طور پر معاندانہ برتاؤ کا مظاہرہ کیا گیا۔ مثال کے طور پر کتاب 'تاریخِ ادبِ مسلمانِ پاک وہند' کی آٹھویں جلد میں انیسؔ کی شاعری کے بارے میں صرف انیس ۱۹ صفحات قلمبند کیے گئے اور ان میں بھی انیسؔ کی زندگی سے کچھ جزئی واقعات درج کیے گئے ہیں۔ محمد صادق صاحب کی کتاب 'تاریخِ ادبِ اردو' جو انگریزی زبان میں تصنیف کی گئی ہے اور جسے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا ہے اور جو غالباً عالمی سطح پر انگریزی داں قارئین کے مطالعے میں آئے گی اس میں فاضل مصنف نے انیسؔ کو ایک ایسے اوسط درجے کے شاعر کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو اپنے انتقال کے بعد تاریخ کے دھندلکے میں پہنچ گئے۔ مصنف نے بادلِ ناخواستہ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہ انیسؔ کے یہاں ان کے ہمعصر دبیرؔ کے مقابلے میں زبان کے لطیف جذبات و احساسات بہتر پائے جاتے ہیں، اپنے انگریزی داں قارئین کو یہ تأثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مرثیہ گو شعراء اور فنِ مرثیہ گوئی کسی خاص اہمیت کے مستحق نہیں۔ میری رائے میں جس کسی نے بھی فنِ مرثیہ گوئی کا سنجیدگی اور نیک دلی سے مطالعہ کرنے کی تکلیف گوارا کی ہو اور جسے سالانہ مجالسِ مرثیہ خوانی میں شرکت کا شرف حاصل ہوا ہو، جو اردو زبان کے مرثیوں کا خاص مقصد رہا ہے، وہ بجا طور پر اس قسم کے تأثر دلانے پر اور فاضل مصنف کے اس فیصلہ کن بیان پر یقیناً غم و غصے کا اظہار کرے گا کہ، ''بہرحال، میرے پاس انیسؔ کے خلاف شکایات کی ایک طویل فہرست موجود ہے، ان کے اسلوب کے سلسلے میں بھی اور ان کی

جذبات نگاری کے سلسلے میں بھی۔ مجھے ان کا (انیسؔ کا) اسلوبِ بیان اکثر ناقص نظر آتا ہے اور ان کی جذبات نگاری میں بناوٹ۔ اکثر و بیشتر اس امر کے پس پردہ انیسؔ کے کلام میں رقت انگیزی پیدا کرنے کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے اور کئی دیگر مقامات پر ان کے غیر یقینی مذاقِ سخن کا مظہر ہے۔ جو بات ان کے کلام میں بار بار کھٹکتی ہے وہ ہے ان کے ہاں روزمرہ کا بکثرت استعمال اور گریہ وزاری پیدا کر کے سستی مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش۔ ان کے دفاع میں ہم صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کی اختراعات کے استعمال پر انھیں ان کی رقت انگیزی پیدا کرنے کی خواہش نے اکسایا ہے، لیکن کس معیار کی رقت انگیزی وہ لا سکے! اس رقت انگیزی کی حیثیت کیا ہے؟''

جب بھی اردو میں مرثیہ گوئی پر بحث ہوتی ہے اس قسم کی آرا، بدقسمتی سے انوکھی نہیں ہیں اور ہم سب اس ظریفانہ چوٹ 'بگڑا شاعر مرثیہ گو' سے واقف ہیں۔

ذاتی طور پر میری رائے اردو شاعری کی اس اچھوتی اور شاندار صنف سخن میں طبع آزمائی کرنے والے جلیل القدر شعراء کے بارے میں بالکل مختلف ہے۔ اس مقالے میں انیسویں صدی کے لکھنؤ کے شعراء کی تخلیقات کے حوالے سے میں اس امر کو واضح کرنے کی کوشش کروں گا کہ اردو شاعری کی اصنافِ سخن میں مثنوی کی صنف بہتر طور پر سمجھے جانے کی اور قدردانی کی مستحق ہے۔ میں پہلی بار ۱۹۶۹ میں لکھنؤ گیا۔ میرا لکھنؤ پہنچنا اتفاقاً نہیں بلکہ عمداً محرم الحرام کے پہلے دس دنوں میں ہوا جن دنوں کربلا میں رونما ہونے والے واقعات معرکہ کربلا اور حضرت امام حسین عالی مقام کی المناک شہادتِ عظمیٰ کو نہایت دردمندانہ احساسات و جذبات کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے اور تعزیہ داری کی رسومات کی نمائش کے ذریعے حقیقی رنج والم کا اظہار کیا جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے میں ایک نامور نواب صاحب کے گھر ٹھہرا ہوا تھا جو بچپن میں سنے ہوئے قصوں کے ذریعے لکھنؤ کے شاندار ماضی اور اس کی شان و شوکت سے واقفیت رکھتے تھے۔ یقیناً انھوں نے انیسویں صدی کے لکھنؤ شہر کی شان و شوکت اور وہاں کی تہذیب کے بارے میں اس طرح گفتگو کی کہ گویا انھوں نے وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اور چشم دید تجربہ کیا ہو۔ میں ہر صبح بلا ناغہ لکھنؤ کی اُس چلچلاتی دھوپ میں نواب صاحب کے ہمراہ پاپیادہ اس جگہ جاتا تھا جہاں مجلس مرثیہ خوانی منعقد کی

جاتی ہے۔ سفر کا کچھ حصہ میں ننگے پیر طے کرتا تھا (یہ تھی اس مجلس کی طرف گامزن ہونے والوں کی سعادت مندی)۔ بجائے اس کے کہ انیسؔ کے مندرجہ ذیل اشعار کو بلا وجہ کی نری مبالغہ آمیزی کہیں ہمیں ایمان دارانہ طور پر یہ کہنا ہوگا کہ یہ اشعار اس راستے کی صحیح کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں جس راستے سے چل کر ہم اس مجلس میں پہنچتے تھے۔

گرمی کا روزِ جنگ کی کیونکر کروں بیاں ڈر ہے کہ مثل شمع نہ جلنے لگے زباں
وہ لوں کہ الحذر وہ حرارت کہ الاماں رن کی زمیں تو سرخ تھی اور زرد آسماں
آبِ خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

لوگوں کا بہت بڑا ہجوم ان مجالسِ مرثیہ خوانی میں شرکت کرتا تھا اور فرش پر بیٹھ کر کارروائی کے آغاز کے مشتاقانہ منتظر رہتے تھے۔ ان سب کو واقعہ کربلا زبانی یاد تھا۔ نہایت فصیح و بلیغ اردو میں ذاکرین جو خطبات دیا کرتے تھے ان میں سامعین کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ واقعات تو سالہا سال سے دہرائے جارہے تھے اور سامعین سنتے آرہے تھے۔ سامعین حضرت امام حسین کے سفر، خواتینِ اہل بیت کی زبوں حالی، پیاس کی شدت سے ان کے عزیزوں اور قرابت داروں کی اموات، بے رحمانہ اور سفاکانہ طریقے سے جاں نثارانِ محمد کے اس چھوٹے سے قافلے کو دریائے فرات کے پانی سے محروم کرنا اور بالآخر حضرت علی کے لختِ جگر اور پیارے نبیؐ کے لاڈلے نواسے کا بے رحمانہ قتل اور اس روز ان کا جامِ شہادت نوش کرنا ان سب باتوں کے پس منظر سے اور اس کی ہر تفصیل سے پورے طور پر باخبر تھے لیکن پھر بھی ذاکر کی تقریر سے مجمعے میں شدید جذبات کا اظہار ہورہا تھا اور آنسوؤں کے دریا بہہ رہے تھے۔ ان کے اس وقت کے جذبات کے حقیقی ہونے میں قطعاً کوئی شک و شبہ نہیں ہوسکتا۔ ایسا لگتا تھا کہ گویا یہ سب لوگ اس واقعے کے بارے میں پہلی بار سن رہے ہوں اور اس المناک سانحے میں شہادت پانے والے لوگ ماضی بعید کے تاریخی اشخاص نہیں بلکہ ان کے اپنے عزیز و اقارب ہیں۔ یہ مقررین مجمع کے موڈ کا صحیح طور پر اندازہ لگالیتے تھے اور اپنی خطابت کی جادو بیانی سے لوگوں میں ایسے جذبات و احساسات پیدا کررہے تھے کہ لوگ مسحور ہوجاتے تھے اور ان کا آس پاس گم

ہو جاتا تھا۔

قربان صنعتِ قلمِ آفرید گار | تھی ہر ورق پر صنعتِ ترصیع آشکار
عاجز ہے فکر سے شعرائے ہنر شعار | ان صنعتوں کو پائے کہاں عقل سادہ کار
عالم تھا محو قدرت رب عباد پر
مینا کیا تھا وادی مینو سواد پر

یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ہم لکھنؤ میں نہیں ہیں بلکہ ہمیں درحقیقت جسمانی طور پر عراق کے تپتے ہوئے ریگ زاروں میں لے جایا گیا ہے جہاں پر حضرت امام حسین امام عالی مقام ایک ناہنجار اور بے رحم دشمن کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کرتے ہوئے اپنے خالقِ حقیقی سے ملاقات کا شرف حاصل کرنا تھا۔ ہر وہ مقرر اور ہر وہ شاعر جس کی جادو بیانی سے سارا مجمع مسحور ہو کر رہ جائے یقیناً ان کی خطیبانہ اور شاعرانہ صلاحیتوں کو نہ صرف سراہا جائے بلکہ ان کی اس فن لطیف میں مہارت کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ یقیناً یہ رقت انگیزی اور جاں سوزی پیدا کرنے کا سستا اور عامیانہ حربہ نہیں بلکہ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ ان کا یہ عمل ایمان افروز جذبات واحساسات کے زیر اثر تھا۔

جیسا کہ انیسویں صدی کے اردو ادب کے مطالعے سے ہم جانتے ہیں کہ اردو زبان میں مرثیہ نگاری انیسؔ، دبیرؔ اور ان کے ہم عصر شعراء کی تخلیق ہے۔ مسدس کی عظیم الشان صنف کو مرثیے میں تشکیل دے کر سامعین پر جو برقی اثر انیسؔ اور دبیرؔ نے چھوڑا ہے وہ نہ ان سے پہلے کسی نے کیا اور نہ ہی ان کے بعد۔ ایران میں بھی جو شیعیت کا ایک روایتی گڑھ سمجھا جاتا ہے کسی بھی شاعر نے واقعہ کربلا کو اس شستگی و لطافت سے بیان نہیں کیا ہے۔ مرثیہ گوئی کی یہ روایت پاک و ہند میں نہ صرف آج زندہ ہے بلکہ اس وقت تک زندہ رہے گی جب تک نہ صرف اہل تشیع بلکہ اہل تسنن یہاں تک اہل ہنود بھی سانحہ کربلا کو یاد کرنے کے لیے محرم کے پہلے دس دنوں میں جمع ہوتے رہیں گے۔ جب ہم لکھنؤ اور برصغیر کے دیگر شہروں میں ایسے غیر معمولی مناظر کا مشاہدہ کرتے ہیں جو آج تک سال کے ان ایام میں رونما ہوتے ہیں، ہم شاید ہی محمد صادق جیسے تبصرہ نگاروں کے تبصروں کو معتبر ہونے کا درجہ دے سکتے ہیں جو اس اعلیٰ درجے کی تصنیف کو نہایت آسانی سے ان الفاظ میں مسترد کرتے

ہیں:

''مرثیہ ایک قلیل عرصے تک شمالی ہند میں بہار پر تھا، جب تک اودھ کی سلطنت کا سورج عروج پر رہا جس کے اکثر و بیشتر حکمران شیعہ مسلک کے پیرو تھے اور اس بناء پر مرثیے کے نہایت پرجوش سرپرست۔ اسی لیے ان سلاطین کے ساتھ یہ صنف عروج پر آئی اور ان کا زوال آنے کے ساتھ ساتھ اس پر بھی زوال آ گیا۔ درحقیقت انیسؔ اور دبیرؔ کے بعد اس صنف پر ضعف طاری ہو گیا اور اگرچہ کچھ عرصے تک یہ سانس لیتی رہی اس میں اب وہ ندرت باقی نہیں رہی بلکہ وہی پرانی باتیں دہرائی جانے لگیں۔''

ادیبوں اور دیگر پرعظمت آرٹسٹوں کے مابین موازنہ کرنا اکثر و بیشتر مشکل ہی نہیں بلکہ مہمل بھی ہوتا ہے اور اس سوال کا جواب، جو عام طور پر کیا جاتا ہے کہ آپ کا محبوب شاعر کون ہے، ناممکن ہوتا ہے۔ جب تک کسی شاعر سے متعلق ہماری بحث موضوعی اور داخلی طور پر نہ ہو ہم حتمی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ غالب کی غزلوں میں زیادہ لطافت ہے، بہ نسبت سوداؔ کے قصائد کے یا مسدسِ حالیؔ انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیوں کے مقابلے میں زیادہ احساس دلانے والی اور دلگداز ہے۔ ان مصنفین میں ہر ایک کا اپنا اندازِ بیان اور اپنا علیحدہ مقصد ہے اور ہر ایک نے مختلف حالات میں اور مختلف پس منظر میں لکھا ہے۔ انیسؔ نے جو ایک پرجوش شیعہ تھے اور جن کی تربیت فارسی اور اردو شاعری کی روایات کے تحت ہوئی تھی اور جنھوں نے خطابت کے فنی آداب میں مہارت حاصل کی تھی واقعۂ کربلا کو بیان کرنا اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا اور اپنی ساری زندگی اسی کام کے لیے وقف کر دی تھی اور اپنے اس مقصد میں انھوں نے نہایت شاندار کامیابی حاصل کی۔ یہی وجہ ہے کہ انیسؔ کے اشعار آج تک سامعین اور قارئین کے دل و دماغ میں رچے ہوئے ہیں۔ انیسؔ اور ان کے ہم عصر شعراء مرثیے کو جس ہیئت میں آج ہم دیکھ رہے ہیں اور اس سے مانوس ہیں اس کے موجد ہیں۔ اس تخلیقی جدت کے لیے انھیں اپنے پیشے کی تاریخ میں اعلیٰ مقام دیا جانا چاہیے۔ شاعر کی حیثیت سے انیسؔ کا مقصدِ اوّلین اپنے سامعین کو اپنی جادو بیانی سے مسحور کرنا اور ان کے جذبات کو اعلیٰ و ارفع کرنا تھا۔ انیسؔ روکھے پھیکے تاریخ نویس نہیں جس کے لیے

واقعات کا حقیقت پر مبنی ہونا لازم و ملزوم ہوتا ہے، لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ان کے اس کارِ نمایاں کی قدر و منزلت میں کمی آئے۔

۱۹۴ بند پر مشتمل تصنیف کردہ نہایت مشہور عام نظم میں انیؔس دسویں محرم کو میدانِ کربلا میں رونما ہونے والے واقعات، جس دن حضرت امام حسین نے جامِ شہادت نوش کیا، بیان کرتے ہیں۔ نظم کا آغاز طلوعِ صبح کی منظر کشی سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام غروبِ آفتاب کی خونیں شفق میں معرکۂ کارزار میں بکھری ہوئی پرشجاعت نوجوان سپاہیوں کی لاشوں کے بیان پر ہوتا ہے۔ تمام تر اردو شاعری میں شاید ہی کسی نظم کی اس قدر پر اثر تمہید بندی کی گئی ہو۔

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے ۔۔۔ جلوہ کیا سحر کا رخِ بے حجاب نے
دیکھا سوئے فلک شہِ گردوں رکاب نے ۔۔۔ مڑ کر صدا رفیقوں کو دی اس جناب نے
آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اٹھو! فریضۂ سحری کو ادا کرو

یہاں منظر کشی کمالِ عروج پر ہے۔ سورج اپنی آب و تاب کے ساتھ اس جگہ طلوع ہو رہا ہے جہاں حضرت حسین اور فدایانِ حسین خیمہ زن ہیں۔ یہ وہ دن ہے جس دن حضرت حسین اور ان کے ساتھی آخری بار نمازِ صبح ادا کرتے ہیں۔ ہر ایک شخص اس بات سے واقف ہے کہ آج کے دن خاندانِ اہلِ بیت کا خون بہایا جائے گا۔ فرشتے بذاتِ خود حضور اکرمؐ کے پیارے نواسے کی تقدیر پر خون کے آنسو بہا رہے ہیں۔ کیا ایسے خوبصورت اشعار کو خود ساختہ طور پر رقت انگیزی پیدا کرنے کی کوشش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔؟

بلاشبہ مرثیہ میں بیان کیے گئے یہ واقعات تاریخی اور قدرتی حقائق پر پورے نہیں اترتے، لیکن اس قسم کے خیالات نے ڈانٹے، شیکسپیئر یا نظامؔی جیسے شعراء کو بھی پریشان نہیں کیا۔ انیؔس کے لیے ریگستان کے اس منظر کو بیان کرنا جہاں اہل شجاعت گرمی کی شدت اور تڑپا دینے والی پیاس سے تڑپ رہے ہیں یا اس منظر کو جہاں ہرے بھرے اور لہلہاتے ہوئے باغات جن میں سایہ دار گھنے درخت اگائے گئے ہوں اور جن کی نازک شاخوں میں بنے ہوئے اپنے اپنے آشیانوں میں بیٹھ کر بلبلیں نغمہ سنج ہوں اور گلوں کی جبیں پر چمکتے

ہوئے شبنم کے قطروں سے لطف اندوز ہورہی ہوں۔

وہ دشت، وہ نسیم کے جھونکے، وہ سبزہ زار   پھولوں پہ جا بجا وہ گہر ہائے آب دار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار   بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے زیر☆ گلشن زہراؐ جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

درحقیقت یہ حضرت حسین ہی کا وجود ہے جو کربلا کے ریگستان میں شگفتگی کی فضا پیدا کرتا ہے۔ اس قسم کی منظر کشی کا جائزہ لیتے وقت یہ بات ہمیشہ ذہن نشین ہونی چاہیے کہ اس قسم کی منظر کشی سے انیسؔ کے سامعین بجائے اس کے کہ مایوس ہو جائیں نہایت شاد ہوتے ہیں اور آج ہمارے اس مادّہ پرست دور میں بھی اکثر شاعر کی منظر کشی کے اس آرٹ کو خراجِ تحسین سمجھتے ہیں۔

مبالغہ آرائی، رعایتِ لفظی اور ذو معنی الفاظ کا استعمال ہر دور کی فارسی اور اردو شاعری کا خاصہ رہا ہے لیکن اکثر و بیشتر ان باتوں کو ان شاعروں کے ساتھ جوڑیا جاتا ہے جن کا تعلق اردو کے دبستانِ لکھنؤ سے ہے، جیسے انشاءؔ، آتشؔ اور ناسخؔ جو انیسؔ کے ہم عصر یا تقریباً ہم عصر رہے ہوں۔ انیسویں صدی کے نصف اوّل کے دوران لکھنؤ شہر اپنی دولت کی فراوانی اور تہذیب و شائستگی کے ساتھ ساتھ اپنی شاندار عمارات، خوشنما باغات اور اپنی ماہر رقاصاؤں اور گانے والیوں کے لیے بے حد مشہور تھا۔ شاعری جس میں طرزِ ادائیگی اور بزلہ سنجی اہمیت رکھتے ہوں اس تہذیب کی قدرتی دین ہے جو ان اشعار سے منعکس ہے۔

ایسے مرثیہ نگار جو اپنے ہمہ تن گوش سامعین کو اپنی بامحاورہ زبان، خطیبانہ طرزِ ادا اور اپنے زبان پر عبور کو بروئے کار لاتے ہوئے ان کے ہوش و حواس خیرہ کر کے اور ان پر وجد کی کیفیت طاری کر کے انہیں دنیا و مافیہا سے دور لے جا کر تصورات کی دنیا میں پرواز کرواتے ہیں وہ زبان دانی کی ایسی اختراعیں بروئے کار لاتے ہیں۔ حضرت امام حسین

☆ ﴿صالحہ عابد حسین نے اپنے مرتبہ نسخے کے متن میں زہراؐ اور اختلافِ نسخ کے نوٹ میں زہر گلشن زہراؐ اور نخلِ گلشن زہراؐ لکھا ہے۔ (مرتب)﴾

کی ذاتِ گرامی کے وجود ہی سے کربلا کا وہ ادنیٰ سا ریگستان عرشِ بریں سے بھی زیادہ ارفع و عالی نظر آنے لگتا ہے۔ ساتویں آسمان پر سیارہ زحل اپنے اوپر دسواں اور اس وقت تک غیر موجود آسمان دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔

گردوں پر ناز کرتی تھی اس دشت کی زمیں کہتا تھا آسمانِ دہم چرخ ہفتمیں
پردے تھے رشکِ پردۂ چشمانِ حورعیں تاروں سے تھا فلک اسی خرمن کا خوشہ چیں

دیکھا جو نورِ شمسۂ کیواں جناب پر
کیا کیا ہنسی ہے صبح گلِ آفتاب پر

گرمی کی شدت جسے حسین نہایت بہادری سے برداشت کرتے ہیں اس کی تمازت اس قدر ہے کہ 'خس کی بھینی بھینی خوشبودار مژگاں کے پیچھے دیدۂ نمناک اپنے آبلا پا ہونے کے باعث پناہ لیے ہوئے ہیں'۔

آبِ رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر خسخانہ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر

گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھوں آبلے پائے نگاہ میں

ایک بات جو بیشتر راسخ العقائد قارئین مرثیہ کو کھٹکتی ہے وہ امام حسین کی شان میں بڑھا چڑھا کر کہے جانے والے وہ توصیفی کلمات ہیں جو صرف اور صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے مخصوص ہیں، شاہِ امم، مالک و مولا، جہاں پناہ وغیرہ لیکن انیسؔ کے لیے ان کے اس کارِ عظیم میں حضرت حسین کی ذاتِ گرامی سب سے اعلیٰ ہے اور ان کا اس قدر بے رحمانہ طریقے پر قتل کیا جانا یا ان کا شکست پانا اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا تھا جب تک وہ بذاتِ خود وقت کا تعین نہ کریں۔ جیسا کہ ہم نے مرثیے کے اشعار میں مشاہدہ کیا ہے، ہر وہ جگہ جہاں حضرت حسین کھڑے رہے اس جگہ کو عظمت نصیب ہوئی حتیٰ کہ خود جنت الفردوس میں بھی۔

ہر طرح کی شاعری میں، اور نہ صرف مشرقی تہذیبوں میں، اس قسم کی مبالغہ آرائی کی اجازت تسلیم کی گئی ہے اور اکثر و بیشتر یہ بات انیسؔ کے پیش رو عظیم المرتبت شعراء میں بھی

دیکھی جاسکتی ہے۔ اٹھارویں صدی کے نامور شاعر محمد رفیع سودا کے ہاں، جن کے کلام کا بیشتر حصہ قصائد ہیں جو مشہور اور اہم مذہبی اور غیر مذہبی شخصیات کی تعریف میں لکھے گئے، اس قسم کی مبالغہ آمیزی کو معیوب نہیں سمجھا گیا بلکہ روا رکھا گیا۔ ایک سے زائد موقعوں پر سودا نے، جو خود شیعہ تھے نہ صرف حضرت علی اور حضرت حسین کو ان محاسن سے نوازا ہے بلکہ کچھ غیر اصولی حکام، مثلاً دہلی کے بدنام گورنر عماد الملک کی شان میں بھی ربانی اور متبرک اوصاف کا استعمال کیا ہے اور ان الفاظ کو بعد میں دوبارہ شائع ہونے والے ایڈیشنوں میں بھی خارج نہیں کیا گیا بلکہ جوں کا توں رکھا گیا۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ایک شاعر ذہن کو بذریعہ شاعری دور دور کا سفر کرا سکتا ہے بمقابلہ ایک نثر نگار کے۔ اردو زبان کے مرثیے کا خاص مقصد لوگوں کو کربلا کے المناک سانحے کی یاد دلانا تھا اور خاص طور سے شیعہ مسلک پر چلنے والوں پر ماضی میں ان کے ساتھ ہونے والے برتاؤ اور ان کی زبوں حالی کو ظاہر کرنا تھا۔ اسی طرح مرثیے کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ بلا احساسِ ندامت، دل سوزی کا اظہار ہو اور یہ پہلو انیسؔ کے مرثیوں میں شاندار طریقے پر اجاگر ہو سکا ہے۔

ہر موقع پر بچوں کے ساتھ کیے گئے ظلم وستم کا شدت کے ساتھ تذکرہ کرنے کے لیے جذبات میں دلسوزی اور رقت انگیزی کو ابھارنے والے فقروں جیسے 'وہ ننھے ننھے بچے' کے استعمال سے انیسؔ کا یہ مقصد مکمل طور پر حاصل ہو سکا ہے۔ ننھے منے بچوں کے ساتھ ظلم وستم کے برتاؤ کا تذکرہ سامعین کی آنکھوں میں آنسو لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

وہ چھوٹے چھوٹے ہاتھ وہ گوری کلائیاں آفت کی پھرتیاں تھیں غضب کی صفائیاں
ڈر ڈر کے کاٹتے تھے کماں کش کنائیاں فوجوں میں تھیں نبیؐ و علیؑ کی دہائیاں
شوکت ہو ہو تھی جناب امیرؑ کی
طاقت دکھا دی شیروں نے زینبؑ کے شیر کی

کس حُسن سے حسنؑ کا جوانِ حسیںؑ لڑا گھِر گھِر کے صورت اسد خشم گیں بڑھا
دو دن کی بھوک پیاس میں وہ مہ جبیں لڑا سہرا الٹ کے یوں کوئی دولہا نہیں لڑا
حملے دکھا دیے اسد کردگار کے

مقتل میں سوئے ازرق شامی کو مار کے

انیسؔ جب خواتین کی زبانی گفتگو کرواتے ہیں، جیسے حضرت امام حسین کی ہمشیرہ محترمہ بی بی زینب کے منہ سے تو وہ غیر مرصّع بلکہ نہایت عام بول چال کی زبان استعمال کرتے ہیں جسے سن کر ہر وہ شخص جس نے کسی ماں کی غیض وغضب اور غم و غصے کے عالم میں آہ وزاری سنی ہوگی یا کسی غم زدہ بہن کی آہ وبکا اور گریہ وزاری، وہ فوری تأثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جب حضرت زینب کے دونوں نوجوان بیٹوں نے علم پر اپنا حق جتانے کی بات کی اس وقت ان کی والدہ محترمہ نے ان الفاظ میں ان پر لعنت ملامت کی جن الفاظ میں ایک غم زدہ ہندوستانی عورت اپنے رنج وغم کا اظہار کرتی ہے۔

زینبؑ نے تب کہا کہ تمہیں اس سے کیا ہے کام　کیا دخل مجھ کو مالک و مختار ہیں امام
دیکھو نہ کیجو بے ادبانہ کوئی کلام　بگڑوں گی میں جو لوگے زباں سے علم کا نام

لو جاؤ بس کھڑے ہو الگ، ہاتھ جوڑ کے
کیوں آئے ہو یہاں علی اکبرؑ کو چھوڑ کے

سرکو! ہٹو، بڑھو، نہ کھڑے ہو علم کے پاس　ایسا نہ ہو کہ دیکھ لیں شاہ فلک اساس
کھوتے ہو اور آئے ہوئے تم مرے حواس　بس قابل قبول نہیں ہے یہ التماس

رونے لگو گے تم جو برا یا بھلا کہوں
اس ضد کو بچپنے کے سوا اور کیا کہوں

ہمارا سلسلۂ گفتگو تمہید سے شروع ہوا تھا اور میں نے عرض کیا تھا کہ نظم کی یہ تمہید بندی اردو زبان وادب میں نہایت یادگار اور نا قابل فراموش تمہید ہے۔ آیئے اب ہم حضرت زینبؑ کے آخری نوحے پر ہماری آج کی اس مجلس کا اختتام کرتے ہیں جو یقیناً نہایت بے حس اور سنگدل شخص کی آنکھوں میں بھی آنسو لائے بغیر نہیں رہ سکے گا۔

نیزے کے نیچے جاکے پکاری وہ سوگوار　سید تری لہو بھری صورت کے میں نثار
ہے ہے گلے پہ چل گئی بھیا چھری کی دھار　بھولے بہن کو اے اسدِ حق کے یادگار!

صدقے گئی لٹا گئے گھر وعدہ گاہ میں
جنبش لبوں کو ہے ابھی یادِ الٰہ میں

بھیا سلام کرتی ہے خواہر جواب دو چلا رہی ہے دخترِ حیدر جواب دو
سوکھی زبان سے بہرِ پیمبر جواب دو کیوں کر جئے گی زینبِ مضطر جواب دو
جز مرگ دردِ ہجر کا چارہ نہیں کوئی
میرا تو اب جہاں میں سہارا نہیں کوئی

بھیا میں اب کہاں سے تمہیں لاؤں کیا کروں کیا کہہ کے اپنے دل کو میں سمجھاؤں کیا کروں
کس کی دہائی دوں کسے چلاؤں کیا کروں بستی پرائی ہے میں کدھر جاؤں کیا کروں
دنیا تمام اجڑ گئی ویرانہ ہوگیا
بیٹھوں کہاں کہ گھر تو عزا خانہ ہوگیا

ہے ہے تمہارے آگے نہ خواہر گزر گئی بھیا بتاؤ کیا تہِ خنجر گزر گئی
آئی صدا نہ پوچھو جو ہم پر گزر گئی صد شکر جو گزر گئی بہتر گزر گئی
سر کٹ گیا ہمیں تو الم سے فراغ ہے
گر ہے تو بس تمہاری جدائی کا داغ ہے

گھر لوٹنے کو آئے گی اب فوج نابکار کہیو نہ کچھ زبان سے بجز شکر کردگار
خیمے میں جب کہ آگ لگا دیں ستم شعار رہیو مری یتیم سکینہ سے ہوشیار
بیزار ہے وہ خستہ جگر اپنی جان سے
باندھے نہ کوئی اس کا گلا ریسمان سے

رضا علی عابدی
(لندن)

ہمارے ہیں انیس

کسی نے مجھ سے کہا کہ اگر میر انیسؔ آج زندہ ہوتے تو دو سو برس کے ہوتے۔
میں نے کہا، ''میر انیس آج زندہ ہیں اور ابھی صرف دو سو برس کے ہوئے ہیں۔''
ہمارے شاعر اپنے کسی محبوب کو ذہن میں رکھ کر شعر کہتے ہیں۔ آخر یہ ہوتا ہے کہ نہ وہ محبوب رہتا ہے اور نہ وہ شاعر۔
میر انیسؔ نے اپنے لیے ایسا محبوب چنا ہے کہ جب تک وہ محبوب رہے گا، میر انیسؔ کے شعر زندہ اور مصرعے تابندہ رہیں گے، اور یہ محبوب مرنے والا نہیں۔
بلا شبہ اردو شاعری کی بنیاد عشق پر رکھی ہے مگر عشق بھی تو ہزار طرح کے ہوتے ہیں۔ اب کوئی انیسؔ کے عشق کو دیکھے کہ جو کوئی صدقِ دل سے اس عشق میں ڈوب گیا اور پھر ایسا ابھرا کہ محبتوں کے افق پر مانندِ آفتاب چمکنے لگا۔
مرثیے کہنے کی روایت کب سے چلی آتی ہے، کہنا مشکل ہے۔ اہل عرب تو عام گفتگو بھی اشعار کی زبان میں کیا کرتے تھے۔ کیا عجب کہ جب کربلا سے قیدی شام لائے گئے ہوں گے اور انھوں نے راہ میں ملنے والوں کو اپنے دکھوں کی داستان سنائی ہوگی، مرثیہ گوئی کی بنیاد اسی وقت پڑ گئی ہو۔
یہ تو طے ہے کہ کربلا کے واقعات کو اشعار میں بیان کرنے کا سلسلہ عربی اور فارسی سے چلا اور جب اردو زبان نے پہلے پہل آنکھ کھولی اور دہن کھولا، اللہ، محمد اور آلِ محمد کے ذکر سے کھولا۔ چنانچہ دکن میں لاجواب مرثیہ کہا گیا۔ کہنے کا یہ انداز دلّی پہنچنا تھا سو پہنچ کر رہا۔
زبانِ اردو کا کون سا شاعر ہوگا جس نے ذکرِ آلِ محمدؐ نہ کیا ہو اور جس کی آنکھ سے آنسو کا اور جس کے قلم سے لہو کا قطرہ نہ ٹپکا ہو۔
انیسؔ کے بزرگ دلی ہی سے اٹھ کر فیض آباد گئے، جہاں اس روز قدرت نے ضرور

تبسم کیا ہوگا جس روز میر خلیق کے گھر میں اس بچے کی ولادت ہوئی ہوگی جس کے بارے میں کہتا ہوں کہ ابھی صرف دو سو برس کا ہوا ہے۔

میر خلیق کوئی ۳۵ برس کے تھے اور غزل کے بعد مرثیے کو بامِ عروج تک پہنچا چکے تھے کہ خدا نے یہ فرزند دیا۔ باپ نے بیٹے کی تربیت کا جو اہتمام کیا اس میں اس ادبی، تہذیبی اور مذہبی ماحول کو پیش نظر رکھا جس میں انیسؔ کو زندگی گزارنا تھی۔ چنانچہ انیسؔ کے لیے جو استاد چنے گئے ان میں مشہور شیعہ عالم مولوی میر نجف اور سرکردہ سنی عالم مولوی حیدر علی شامل تھے۔ شعر کی تربیت کے لیے انیسؔ کو ناسخؔ کی خدمت میں بھیجا گیا جو اس وقت اردو زبان کے سب سے بڑے شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔

انیسؔ کا تخلص حزیںؔ تھا۔ ناسخؔ نے اسے منسوخ کرکے انیسؔ تجویز کیا۔ استاد کے سائے میں انیسؔ نے غزلیں کہیں لیکن شعر وسخن کا اگر کوئی خدا ہے تو اسے کچھ اور ہی منظور تھا جس نے انیسؔ کی راہ مرثیہ گوئی کی سمت موڑ دی۔

اودھ کا دارالحکومت فیض آباد سے اٹھ کر لکھنؤ جا چکا تھا، ساتھ ہی یہاں کی رونقیں بھی وہاں منتقل ہوگئی تھیں۔ خوشحالی اور قدر دانی وہاں ٹوٹ کر برس رہی تھی اور ایک خلقت لکھنؤ کی جانب چلی جاتی تھی۔

انیسؔ فیض آباد میں مرثیہ کہتے اور پڑھتے رہے۔ لکھنؤ میں دبیرؔ کی مرثیہ گوئی کا ڈنکا بج رہا تھا لہٰذا انیسؔ فیض آباد سے لکھنؤ جاتے اور مرثیہ پڑھ کر لوٹ جاتے مگر زبان پر انھیں جیسی قدرت حاصل تھی، ان کے کلام میں جو قوت تھی اور ان سب سے بڑھ کر جو پڑھنے کا کمال انھیں حاصل تھا اسے دیکھ کر اہلِ لکھنؤ نے جوق در جوق ان کی مجلسوں میں جانا شروع کیا اور دیکھتے دیکھتے میر انیسؔ مرزا دبیرؔ کے مدمقابل بن گئے۔

مداحوں کی مداحی کا یہ حال ہوا کہ لکھنؤ دو حلقوں میں بٹ گیا۔ کچھ لوگ انیسیئے کہلائے اور کچھ دبیریئے۔

اسی دوران میر انیسؔ نے فیض آباد چھوڑا اور لکھنؤ میں بس گئے۔ یہ امجد علی کا دور تھا اور شہر لکھنؤ اور اہلیانِ لکھنؤ پر ہن برس رہا تھا۔

انیسؔ اور دبیرؔ ایک دوسرے کے مقابلے پر آگئے اور اس مقابلے نے مرثیہ گوئی کے

ہنر کو کچھ اور جلا بخشی۔

اودھ کی خوش حالی دیکھ کر اپنی حکمرانی کا جال پھیلائے ہوئے فرنگیوں کی رال کب سے ٹپک رہی تھی۔ ۱۸۵۶ء میں انھوں نے لکھنؤ کو دبوچا اور جی بھر کر لوٹا۔ شہر اجڑ گیا۔ شہر کی صحبتیں مٹ گئیں اور مجلسیں ویران ہو گئیں۔

فکرِ معاش میں اب انیسؔ نے مرثیہ خوانی کے لیے لکھنؤ سے باہر جانا شروع کیا اور عظیم آباد، بنارس، الٰہ آباد، کانپور اور حیدر آباد میں واقعۂ کربلا اس طرح چھیڑا کہ دور دور تک لوگ ان کے کلام اور کمال سے واقف ہو کر ان کے مداح بن گئے۔

لکھنؤ کے لٹنے نے انیسؔ کے کلام میں کچھ اور تاثیر بھر دی۔ شہر کے اجڑنے نے سننے والوں کے دلوں کو اور رقیق کر دیا۔ عالم یہ تھا کہ انیسؔ منبر پر بیٹھے مصائب پڑھ رہے ہیں، کبھی آواز کا اتار چڑھاؤ دلوں پر اثر کرتا ہے، ناگاہ چشم و ابرو کے ایسے اشارے کرتے کہ گریہ کرتے ہوئے لوگ اپنی آنکھیں بند نہیں ہونے دیتے کہ کوئی اشارہ دیکھنے سے رہ نہ جائے، یک لخت بدن کو ایک ذرا سی ایسی جنبش دیتے کہ سننے والوں کے سامنے منظر گھومنے لگتے۔

یہ بات تو مشہور ہے کہ انیسؔ کے پڑھنے کی خوبی یہ بھی تھی کہ جو کچھ بھی کہتے، ہر طرف اسی بات کی تصویر سی کھنچ جاتی۔ کہیں لفظ دشت اس خوبی سے ایسا کھینچا کہ شادؔ عظیم آبادی کے بقول، وسعت دشت آنکھوں میں پھر گئی۔

آخر آخر میں شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے میر انیسؔ کو مرثیہ پڑھتے سنا۔ لکھتے ہیں کہ انیس بوڑھے ہو گئے تھے مگر ان کا طرزِ بیان جوانوں کو مات کرتا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ منبر پر ایک کل کی بڑھیا بیٹھی لڑکوں پر جادو کر رہی ہے۔ جس کا دل جس طرف چاہتی ہے پھیر دیتی ہے اور جب چاہتی ہے ہنسا دیتی ہے اور جب چاہتی ہے رُلا دیتی ہے۔

ایک مجلس میں جب انھوں نے یہ شعر پڑھا۔

ساتوں جہنم آتش فرقت میں جلتے ہیں

شعلے تری تلاش میں باہر نکلتے ہیں

تو شعر اس انداز سے پڑھا کہ لوگوں کو شعلے بھڑکتے دکھائی دینے لگے۔

ایک مجلس میں انیسؔ نے جب یہ مصرعہ پڑھا۔

صحرا زمرّدی تھا پھریرے کے عکس سے

تو مرثیے کو اس طرح ذرا سا پلٹ دیا کہ پھریرے کا لہرانا آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

ایک بار مرثیہ پڑھنے بیٹھے اور پہلا ہی مصرعہ پڑھا تھا۔

آج شبیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے

کسی نے اٹھ کر صدا لگائی کہ بس میر صاحب، مرثیہ تو یہیں مکمل ہو گیا۔

آج سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ انیس نے یہ شعر کس خوبی سے پڑھے ہوں گے کہ جب ایک راہ گیر لٹے ہوئے میدانِ کربلا سے گزرا اور امام سے سارا واقعہ سننے کے بعد اصرار کیا کہ اپنا نام تو بتایئے۔ اس پر امام مظلوم کا یہ جواب لوگوں نے انیس کی زبانی سنا ہو گا تو خدا جانے کیا کیفیت ہو گی۔

یہ تو نہیں کہا کہ شہِ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

اور جب حضرت حُر نے امام حُسین کی گود میں دم توڑتے ہوئے یہ کہا ہو گا۔

کوچ نزدیک ہے اے بادشہِ عرش نشیں
لیجئے تن سے نکلتی ہے مری جانِ حزیں
بات بھی اب تو زبان سے نہیں کی جاتی ہے
کچھ اُڑھا دیجئے مولا مجھے نیند آتی ہے

۱۸۷۴ء کے دوران انیسؔ بیمار رہے۔ سال کے آخری مہینے کی دسویں تاریخ تھی، غروبِ آفتاب سے ذرا پہلے انھیں بھی نیند آ گئی۔

اودھ اخبار لکھنؤ نے انیسؔ کی وفات کی خبر دیتے ہوئے لکھا کہ حضرت دبیرؔ ان کی نعش پر جا کر بہت روئے اور فرمایا کہ ایسے معجز بیان، فصیح اللسان اور قدردان کے اٹھ جانے سے اب کچھ لطف نہ رہا۔

پھر دبیرؔ نے مرثیے نہیں کہے۔ آزردہ رہے اور کچھ عرصے بعد خود بھی چل بسے۔

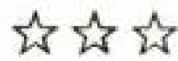
مگر یہ موت بھی خوب ہے، ایک وقفے جیسی لگتی ہے۔ ذرا دیر کو سب کچھ ٹھہرا اور پھر روانہ ہو گیا۔

انیسؔ، اور سچ تو یہ ہے کہ دبیرؔ کی بھی زندگی کا سفر ابھی جاری ہے۔

یہ بھی سچ ہے کہ انیسؔ جیسے شاعر کو بھلانے کے جتن کیے گئے ہیں۔ ان کے نام اور کلام پر طرح طرح کے ٹھپے لگائے گئے ہیں۔ اردو کی درسی کتابوں سے ان کے مرثیوں کے اقتباس آہستہ آہستہ خارج کر دیے گئے ہیں۔ اور تو اور، لوگ انیسؔ کو اُنیس پڑھنے لگے ہیں۔

مگر یہ سارا کا سارا معاملہ دین میں تفریق کا نہیں، ذوق میں تخفیف کا ہے۔

ذوق ہمیشہ کے لیے سویا نہیں کرتا، بس پہلو بدلا کرتا ہے۔ اسے ذرا بیدار ہو جانے دیجئے، آپ دیکھئے گا، ہر اہل ذوق پکارے گا، ہمارے ہیں انیسؔ۔



دلّی کی زبان کا سہارا تھا انیسؔ
اور لکھنؤ کی آنکھ کا تارا تھا انیسؔ
دلّی جڑ تھی تو لکھنؤ اس کی بہار
دونوں کو ہے دعویٰ کہ ہمارا تھا انیسؔ

شمس العلماء الطاف حسین حالیؔ

حجۃ الاسلام مولانا سید ذوالقدر رضوی

میر انیسؔ کی نعت نگاری

کون نہیں جانتا کہ جس طرح لفظ ''مرثیہ'' اردو کی ادبی اصطلاح میں بیانِ واقعاتِ کربلا اور ذکرِ شہادت جناب سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کے لیے مخصوص ہوگیا ہے اسی طرح بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی لفظِ نعت کا اختصاص مدح وثنائے حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ ہے۔

اردو کا شاید ہی کوئی قابل ذکر شاعر ہوگا جس نے نعت نہ لکھی ہو!

میر انیسؔ کے موضوع سے تو نعت کا رشتہ روح وتن کا رشتہ ہے اس لیے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی عظمت کی اَساس اُن کے سبطِ نبیؐ ہونے اور محافظِ دینِ نبیؐ ہونے پر ہی قائم ہے۔ اس لیے نعت کے مضامین مراثی میں فطری اور لازمی طور پر بکثرت پائے جاتے ہیں۔ کہیں کہیں سلسلہ وار مصرعوں یا بندوں میں نعت ہی کے مضامین کا التزام بھی پایا جاتا ہے۔ نعت نگاری کے باب میں انیسؔ اور اُن کے پورے دبستانِ فکروفن کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صرف سراپائے مبارک، آپ کے ظاہری خدوخال، زلف وابرو اور پیکر وپیراہن (چادر اور کملی) ہی کی مدح وستائش تک محدود نہیں رہتے بلکہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرتِ طیبہ، آپؐ کی نبوت کی عظمت واہمیت، آپؐ کی رسالت کی ہمہ گیر شمولیت وابدیت، آپؐ کے پیغام کی کاملیت وخاتمیت نیز آپؐ کے وہ مکارمِ اخلاق جو درحقیقت صفاتِ الٰہیہ کے مظاہر تھے کی ترجمانی، وہ اپنے جذباتِ عشق وجوشِ مودّت کے امتزاج کے ساتھ اس طرح کرتے ہیں کہ اُس میں اصلی، داخلی اور بڑی شاعری کے تمام کوائف پائے جاتے ہیں۔

افسوس ہے کہ اِس وقت اِس ناچیز کو اتنی فرصت میسر نہیں کہ انیسؔ کے تمام یا بیشتر کلام کا مطالعہ کر کے انیسؔ جیسے عظیم سَراپا نگار وسیرت نگار شاعر کے فکروقلم سے تخلیق ہونے والے اُن تمام اشعار کا احاطہ کرسکوں جو اِس موضوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاہم اِس مختصر جائزے میں انیسؔ کے تمام اصنافِ سخن یعنی سلام، رباعی اور مراثی سب ہی سے کچھ کچھ نعتیہ اشعار وابیات کی مثالیں پیش کرنے

کی کوشش کروں گا۔

سلام میں جو عموماً غزل کی عروضی ہیئت میں ہوتا ہے، اگر چہ مرثیہ ہی کے مضامین کو نظم کرتے ہیں لیکن انیسؔ کو بعض نعتیہ مضامین سے بطورِ خاص شغف تھا چنانچہ اُنہیں مضامین کو وہ اپنے مختلف سلاموں میں کبھی کسی ایک شعر میں، کبھی قطعہ بند دو یا دو سے زائد اشعار میں بھی لائے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ واقعہ معراج انیسؔ کا پسندیدہ ترین مضمون ہے۔ چند اشعار سلاموں سے ملاحظہ فرمائیں:۔

ظہورِ نورِ محمدؐ ہُوا خلیلؑ کے بعد　　　چُھپا جو چاند، زمانے میں آفتاب آیا

☆

یوں نُور تھا رسولؐ کا آدم کی صلب میں　　　ہوتی ہے جس طرح سے خبر مبتدا کے ساتھ
نبیؐ کے نقشِ پا ہیں یہ زمانہ جن سے روشن ہے　　　مہ و خورشید کب اس طرح کی تنویر رکھتے ہیں

☆

سحر کو اُٹھ کے زباں سے یہ کام لیتے ہیں　　　خدا کے بعد محمدؐ کا نام لیتے ہیں

بطورِ خاص ذکرِ معراج ملاحظہ فرمائیں:

دیر آئے پر بجلد آئے رسولؐ　　　دور لاکھوں کوس سایا رہ گیا
اللہ اللہ قربِ معراجِ رسولؐ　　　دو کماں سے فرق ادنیٰ رہ گیا
اُٹھ گئے مابین سے سارے حجاب　　　بس فقط آنکھوں کا پردا رہ گیا

☆

لکھا ہے یہ کہ محل تھا وہ اُمِ ہانی کا　　　رسولؐ جانبِ معراج جس مکاں سے چلے
خوشا براقِ سبک رو کی تیز رفتاری　　　اِس آسمان سے گزرے اُس آسماں سے چلے
حریمِ حق میں جو پہنچے تو سر اُٹھا کے کہا　　　خدا کی شان کہاں آ گئے، کہاں سے چلے

ذکرِ معراجِ رسولؐ ہو تو انیسؔ کے قلم سے خوب خوب اشعارِ آبدار نکلتے ہیں۔ ایک سلام کے ذیل کے قطعہ بند اشعار میں معراج ہی کے حوالے سے نعت و منقبت کا کیا حسین اِمتزاج پایا جاتا ہے۔

(ق)

سحر ہوئی شبِ معراج کی تو لوگوں نے　　　جمالِ پاکِ رُخِ سید البشر دیکھا

کہا یہ سب نے غلاموں سے کیجئے ارشاد　　جو کچھ حضور نے، یا شاہِ بحر و بر دیکھا
گہر فشاں ہوئے لعلِ لبِ رسولِ کریمؐ　　کہ سب سے رُتبۂ حیدر زیادہ تر دیکھا
ورائے کرسی و عرشِ عظیم و لوح و قلم　　وصی کا نور ہر اک شے میں جلوہ گر دیکھا
کہاں تلک کہوں، نکلا جو ہاتھ پردے سے　　تو صاف دستِ یداللہِ نامور دیکھا

ولی ولی کی صدا تھی، جہاں جہاں پہنچا
علی علی نظر آئے جدھر جدھر دیکھا



معراج کا واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کا وہ عظیم الشان واقعہ ہے جس کی دینی، مذہبی اور عرفانی اہمیت تو ہے ہی، اس کی فلسفیانہ اور علمی نقطۂ نظر سے بھی بے پناہ فکر انگیزی ہمارے بہت سے اصحابِ فکر و نظر علماء، ادباء اور شعراء کو دعوتِ غور و فکر دیتی رہتی ہے۔ علامہ اقبالؔ کا مشہور شعر ہے ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے ہمیں　　کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں!

بعض شعراء نے معراج ہی کے تعلق سے قدرے تغزل کے پیرایہ میں بھی مضمون آفرینی کی ہے مثلاً پروفیسر احتشام حسین مرحوم کا ایک شعر ہے:

اب کیا دکھا رہا ہے رہِ ماہ و کہکشاں　　ظالم کسی کے نقشِ قدم یاد آ گئے

بہر حال انیسؔ تو واقعۂ معراج سے متعلق مضامین کے عاشق ہیں، جیسے ذکرِ معراج سے اُن پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ذیل کی رباعی میں انہوں نے اس مضمون کو جس شاعرانہ معراجِ کمال تک پہنچایا ہے وہ بھی دیدنی ہے ؎

دُنیا میں محمدؐ سا شہنشاہ نہیں　　کس راز سے خالق کے وہ آگاہ نہیں
باریک ہے ذکرِ قربِ معراج انیسؔ　　خاموش کہ یاں سخن کو بھی راہ نہیں

خالص نعتیہ رباعیوں میں سے ایک یہ بھی ہے جس میں رویتِ باریٔ تعالیٰ جیسے نہایت نازک اور ایک بڑے اختلافی مسئلہ کو انیسؔ نے عجب حُسن و لطافت کے ساتھ ادا کیا ہے ؎

یا ختمِ رُسُل مستِ مئے الفت ہیں　　قدموں کی قسم کہ عاشقِ صورت ہیں
دیکھا جو حضور کو، خدا کو دیکھا　　اِس وجہ سے ہم بھی قائلِ رویت ہیں

رباعیاتِ انیسؔ میں نعتیہ رباعیوں کی تعداد کافی ہے۔ جن میں سے بعض خالص نعتیہ ہیں، بعض میں نعت و منقبت یا نعتیہ اور رثائیہ مضامین ایک ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ انیسؔ نے جہاں نعت و منقبت کی آمیزش کی ہے اُن رباعیوں میں لطف بھی دوچند ہے۔

ہے کون و مکاں میں اختیارِ حیدرؑ　　گردوں ہے سُبک پیشِ وقارِ حیدرؑ
اِک جان ہے، اِک دل ہے بضاعت اپنی　　احمدؐ کے وہ قرباں، یہ نثارِ حیدرؑ!

ہے چادرِ نورِ حق ردائے حیدرؑ　　خورشید ہے نقشِ کفِ پائے حیدرؑ
کہتے ہیں دکھا کے عرش و کرسی کو ملک　　یہ جائے محمدؐ ہے یہ جائے حیدرؑ!

تقریباً اسی مضمون کو اپنے ایک مشہور سلام میں جو ناسخؔ کی زمین میں ہے، اور جس میں ایک کے بعد ایک آٹھ مطلعے ہیں، ایک مطلع میں بھی ادا کیا ہے ؂

کرسی نبیؐ کی عرش جنابِ امیر کا　　وہ شاہ کی جگہ، یہ محل ہے وزیر کا

حمد، نعت اور منقبت جیسے بے پناہ مضامین کو انیسؔ نے ذیل کی رباعی میں جس شاعرانہ چابک دستی سے باندھا ہے اور اُس میں اپنے خاص عقیدے اور عرفانی مسلک کی جس فن کارانہ مہارت کے ساتھ ترجمانی کی ہے وہ کس قدر قابلِ داد، لائقِ تحسین اور مستحقِ ستائش ہے۔ اِس کا فیصلہ قارئین و سامعینِ انیسؔ خود ہی کر سکتے ہیں:

خلّاقِ انام کبریا کو جانا　　عالَم کا رسول مصطفیٰؐ کو جانا
ایماں کا ہمارے اس پہ ہے دارومدار　　جانا جو علیؑ کو، تو خدا کو جانا

حمد و نعت یا منقبتِ ائمۂ دین علیہم السلام کے باب میں اکثر شعراء نے برملا اپنی عاجزی کا اعتراف کیا ہے۔ بعض نے تو اپنی عاجزی کو اس لطافتِ مضمون کے ساتھ بیان کیا ہے کہ وہ خود مضمون آفرینی کا ایک عمدہ نمونہ بن گیا ہے مثلاً: عرفیؔ کا یہ مشہور مقطع ؂

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحرا است
آہستہ کہ رہ بر دَمِ تیغ است قدم را

یا غالبؔ کا یہ مقطع ؂

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

انیسؔ نے بھی اپنی عاجزی کا مضمون ذیل کی بیت میں ادا کیا ہے۔

کیا مدح کفِ خاک سے ہو نورِ خدا کی　　لُکنت یہیں کرتی ہیں زبانیں فصحا کی

بعض مضامین اکثر نعت گو شعراء نے بلا خوفِ الزامِ سرقہ و بے عذرِ توارد اپنے اپنے نعتیہ کلاموں میں باندھے ہیں۔ اُن میں سے ایک آنحضرتؐ کے جسمِ مبارک کا سایہ نہ ہونے کا مضمون بھی ہے۔ یہ مضمون انیسؔ کے سلاموں اور رباعیوں میں بھی قابلِ ملاحظہ ہے!

آدم کو یہ تحفہ، یہ ہدیہ نہ مِلا　　ایسا تو کِسی بشر کو پایہ نہ مِلا
اللہ ری لطافتِ تنِ پاکِ رسولؐ　　ڈھونڈا کیا آفتاب، سایہ نہ مِلا

انیسؔ بنیادی طور پر "مرثیہ" کے شاعر ہیں۔ مرثیہ بھی آلِ رسولؐ و اہلبیتِ رسول کا، سبطِ رسولؐ و محافظِ دینِ رسول کا۔ اِس اعتبار سے نعت و رثاء کے مضمون ایک ہی رباعی میں سمو دینا بھی انیسؔ کا کمال ہے۔

اے یارو! محرّم کا مہینہ آیا　　سر پیٹو، غمِ شاہِ مدینہ آیا
کیا بیٹھے ہو، سر پہ خاک ڈالو یارو!　　احمدؐ کا تباہی میں سفینہ آیا

☆

خوں میں شہِ مظلوم کا سینہ ڈوبا　　بطحا ہُوا برباد مدینہ ڈوبا
کیا بیٹھے ہو، سر پہ خاک اُڑاؤ یارو!　　خشکی میں محمد کا سفینہ ڈوبا

☆

احساں نہیں گر بزمِ عزا میں آئے　　آئے تو پناہِ مصطفٰیؐ میں آئے
اِس بزم میں آئے جو محبانِ علیؑ　　راحت ہے کہ رحمتِ خدا میں آئے

☆

مضمونِ نعت کے ساتھ عبرت و رثا کے مضمون کو سمو کر سلام کا شعر کہا ہے۔

انساں کو چاہیئے کہ خیالِ قضا رہے　　ہم کیا رہیں گے جب نہ رسولِ خدا رہے

اسی طرح سلاموں کے چند شعر اور ملاحظہ ہوں:

سوارِ دوشِ رسولؐ خدا کی چھاتی پر　　چڑھا ہے شمر زمانے کا انقلاب یہ ہے

☆

ملبوسِ مصطفٰےؐ کا کرو پاس، ظالمو!　　دستار بھی وہی ہے وہی پیرہن بھی ہے
چلّائی بنتِ فاطمہ اس دم کہ او شقی　　کیا تجھ کو پاسِ روحِ رسولِ زمن بھی ہے

شاہ کہتے تھے، لعینو! نہ ستاؤ مجھ کو   روحِ احمدؐ نہ کہیں قبر سے نالاں نکلے



ایک رباعی میں نعتیہ مضمون کے پیوند کے ساتھ انتہائی خوبصورت تعلّی ملاحظہ ہو:

بالیدہ ہوں، وہ اوج مجھے آج مِلا   ظِلِّ علمِ صاحبِ معراج ملا
منبر پہ نشست، سر پہ حضرت کا عَلَم   اب چاہیے کیا، تخت مِلا، تاج مِلا

انیسؔ نے یوں تو سلام بھی کہے، رباعیاں بھی کہیں اور بہت کہیں، چند مخمس بھی اُن سے یادگار ہیں لیکن اُن کا خاص میدان تو مرثیہ ہی ہے۔ مرثیہ کے بحرِ ذخار سے نعتیہ بندوں، بیتوں اور مصرعوں کا بالاستیعاب انتخاب بہت مشکل ہے اور وہ اس وقت میرا مقصد بھی نہیں ہے۔ چند مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ کی شجاعت کے بیان میں انیسؔ کی یہ بیت تو یقیناً شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ آنحضرتؐ کا معجزہ شق القمر مشہور ہے کہ آپ کے ایک اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہو گیا تھا، انیسؔ نے یہاں آفتاب کے چیرنے کا مضمون ہو سکتا ہے وہیں سے استفادہ کیا ہو ؎

طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی
رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

اَب انیسؔ کے مشہور مرثیے "گلزارِ ارم" (ع یارب چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر) میں آنحضرتؐ سے مناجات وطلب کا یہ انداز ملاحظہ فرمایئے:

خواہاں نہیں یا قوتِ سخن کا کوئی، گو آج   ہے آپ کی سرکار تو، یا صاحبِ معراج
اے باعثِ ایجادِ جہاں، خلق کے سرتاج   ہو جائے گا دم بھر میں غنی بندۂ محتاج
امید اسی گھر کی، وسیلہ اسی گھر کا
دولت یہی میری یہی توشہ ہے سفر کا

اسی کے بعد والے بند کی بیت ہے ؎

کیا مدح کفِ خاک سے ہو نورِ خدا کی
لکنت یہیں کرتی ہیں زبانیں فصحاء کی

اسی مرثیے میں انیسؔ امامِ حسین علیہ السلام کی زبان سے اپنے نانا کی فضیلت بیان

کرتے ہیں ۔

نانا وہ کہ ہیں جن کے قدم عرش کے سرتاج
قوسین مکاں، ختمِ رُسل، صاحبِ معراج

انیسؔ کے مراثی میں اِس طرح کے مقامات بے شمار ہیں۔ جن کا احاطہ کرنا دشوار ہے۔ اس لیے کہ واقعۂ کربلا میں آنحضرتؐ ہی کے اہلبیت اور آپ ہی کے دین و سیرت و سنت پر تو ساری بلائیں ٹوٹی تھیں، جنھیں آپ کے نواسے حضرت سید الشہدا امام حسین علیہ اسلام نے بکمالِ شجاعت و صبر اِس طرح رد کیا کہ اَب قیامِ قیامت تک دین و سیرتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی مَسخ نہیں کر سکتا۔ مضمون کو طوالت سے بچانے کے لیے اب فی الحال صرف ایک بند اور ایک بیت پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ یہ بند امام حسین علیہ السلام کی زبان مبارک سے میدانِ مبارزہ میں رَجز کے عنوان سے انیسؔ نے ادا کیا ہے کہ امام فرماتے ہیں:

گر فیضِ ظہورِ شہ لولاک نہ ہوتا — بالائے زمیں گنبدِ افلاک نہ ہوتا
کچھ خاک کے طبقے میں بجز خاک نہ ہوتا — ہم پاک نہ کرتے تو جہاں پاک نہ ہوتا

یہ شور اذاں کا سحر و شام کہاں تھا
ہم عرش پہ جب تھے تو یہ اسلام کہاں تھا

یہ بیت انیسؔ کے مرثیہ ع ''جب بادبانِ کشتیِ شاہِ امم گرا'' سے اقتباس کر رہا ہوں۔ بیت امام حسینؑ کے فرزند شبیہِ مصطفیٰ حضرت علی اکبرؑ کے تعلق سے ہے مگر انیسؔ کی نعتیہ فکر و مضمون آفرینی کی ایک بہترین مثال ہے ۔

یہ بیت انیسؔ کے مرثیہ ع ''جب بادبانِ کشتیِ شاہِ امم گرا'' سے اقتباس کر رہا ہوں۔ بیت امام حسینؑ کے فرزند شبیہِ مصطفیٰ حضرت علی اکبرؑ کے تعلق سے ہے مگر انیسؔ کی نعتیہ فکر و مضمون آفرینی کی ایک بہترین مثال ہے ۔

تصویر سر سے تا بہ قدم مصطفےٰ کی ہے
اس حُسن کے بشر بھی ہیں، قدرت خدا کی ہے!

☆☆☆

صفدر ہمدانی (لندن)

مقروض ہیں انیس کے ہم لوگ آج بھی

(میر انیسؔ کے دوسو سالہ جشن کی لندن اسلامک سینٹر میں ہونے والی اولین تقریب کے موقع پر لکھا گیا مختصر مقالہ)

میرا تعلق بھی مرثیہ نگار قبیلے سے ہے لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ غیر تو غیر خود اپنوں نے بھی مرثیہ نگار کو کم تر شاعر اور مرثیہ نگاری کو کمتر صنف سخن سے زیادہ کوئی مقام نہیں دیا اور مرثیہ جیسی توانا ادبی صنف کو صرف محرم الحرام تک محدود کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی سر پرستی سے بھی گریز کیا۔ حد تو یہ ہے کہ ہماری اپنی نوجوان نسل کو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ مرثیہ بھی کوئی عالمی سطح کی ادبی صنف ہے اور انیسؔ و دبیرؔ عالمی سطح کے بڑے شعراء ہیں۔ ذرائع ابلاغ اور مواصلاتی انقلاب کے اس دور میں صرف مغربی ممالک اور دیارِ غیر میں ہی نہیں بلکہ بھارت اور پاکستان جیسے اردو کے اصل ثقافتی اور تاریخی مراکز میں بھی رہتے ہوئے عمومی طور پر ہمارے بچوں اور جوانوں کی مرثیہ نگاری سے عدم واقفیت اور انیسؔ و دبیرؔ جیسے بلند قامت فنکاروں سے واجبی سی شناسائی یا تو ہمیں جھنجھوڑتی نہیں یا پھر بے حسی کی سحر آلودہ فضا نے ہمیں پتھر کا بنا دیا ہے، جو ایک لمحۂ فکریہ ہے۔

خدائے سخن اور امامِ مرثیہ نگاراں میر ببر علی انیسؔ لگ بھگ دوسو سال قبل ۱۸۰۳ میں پیدا ہوئے اور تقریباً ۷۲ سال کی عمر میں ۱۸۷۴ میں وفات پائی۔ سچ تو یہ ہے کہ آج دوسو سال گزرنے کے باوجود بھی ہم اردو بولنے والے اور خود اردو ادب انیسؔ کا مقروض ہے اور ہم اس احسان کی شاید پہلی قسط بھی ادا نہیں کر سکے ہیں۔

اور بلا شبہ ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا دعویٰ کرنے والے اور ایک ہزار سے زائد مرثیے لکھنے والے میر ببر علی انیسؔ کا ہر مرثیہ فصاحت و بلاغت، سلاست و روانی، آہنگ و اسلوب، رزم و بزم، تشبیہات و استعارات، الفاظ و بحور، رعایتِ لفظی،

صنائع معنوی اور تاثیرِ فکر کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے۔

شاعری اور فکرِ شعر چونکہ میرے نزدیک دو مختلف موضوعات ہیں اس لیے یہ ضرور عرض کر دوں کہ تخلیقِ شعر کے آغاز کے برعکس فکرِ شعر ہزاروں سال بعد اس میں داخل ہوئی۔ فکرِ شعر کسی بھی ادب کا دراصل وہ مرکزی جوہر ہے جس کی کسوٹی پر وہ ادب جاودانی اور معیارِ عالمی کا حقدار ٹھہرتا ہے۔ اردو ادب کو اگرچہ عالمی اور بین الاقوامی سطح پر بوجوہ وہ پذیرائی حاصل نہیں ہوئی جو دوسری بے شمار زبانوں کے ادب کو حاصل ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اردو ادب کسی دوسرے عالمی ادب سے کسی بھی طور کم تر ہے۔ عالمی سطح پر یہ پذیرائی حاصل نہ ہونے کی بے شمار وجوہات ہیں اور میرے نزدیک اس کی اہم ترین وجہ اس تاثر کا عام ہونا ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اردو ادب کا دامن اگرچہ اصنافِ ادب کے حوالے سے بے حد متنوع اور معیاری تخلیقی سرمائے سے مالا مال ہے لیکن مرثیہ اردو ادب کی ایک ایسی قوی صنف ہے جسے اگر اب بھی چاہا جائے جسے عالمی ادب کے معیار کے حوالے سے کسی بھی طرح ثانوی درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

یہ دعویٰ شاید محققین کے لیے دعوتِ فکر ہو کہ واقعہ کربلا کو جو تخلیقی ترجمانی اردو مرثیے میں ہے شاید کسی بھی دوسری زبان کے ادب میں نہ ملے۔ کسی کے لیے بھی اس سے انکار ناممکن ہے کہ اردو کی تقریباً تمام دوسری اصنافِ سخن اور ان کے تمام تکنیکی، ہیئتی اور ادبی عناصر مستعار لیے گئے ہیں جبکہ مسدس کی شکل میں اردو مرثیہ مکمل طور پر اردو کی اپنی ایجاد ہے۔ عام لوگ تو کجا خود اردو ادب خاص طور پر مرثیے کے نقادوں کا صرف ''مرثیے'' کے لفظ کی وجہ سے کہ یہ عربی کا لفظ ہے، اردو مرثیے کو عربی اور فارسی مرثیے کی توسیع قرار دے دینا میرے جیسے طالب علم کی سمجھ سے باہر ہے۔ یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ دوسری اصناف ادب اردو کے ناقدین کی طرح مرثیے کے ساتھ بھی یہ ستم ہے کہ اس کے ۹۹ فیصد نقاد خود مرثیہ نگاری کے فن اور رموزِ مرثیہ نگاری کی لوازمات سے ناآشنا ہیں لہٰذا وہ عملی تجربہ کے لکھتے ہوئے مرثیہ نگار کس طرح خود کربلا میں اترتا ہے اور کس کرب سے گزرتا ہے ان کی تنقید کو فقط کئی سو صفحات کی ضخیم تنقیدی کتاب تو بنا سکتا ہے مگر ایسی تصنیف حقیقی فکری عملی حسیات سے خالی ہوتی ہے۔

مرثیہ نگاری کس محنتِ شاقہ اور مکمل دسترس کی متقاضی ہے اس امر کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ تاجِ اردو کے سب سے روشن ہیرے اور عالبِ کلِ غالب کے مقتدیٰ اسد اللہ خاں غالبؔ جیسے قادر الکلام شاعر نے بھی مجتہد العصر مفتی میر عباس کے کہنے پر اردو مرثیہ لکھنا شروع کیا اور غالبؔ کے سوانح نگار کے بقول یہ مرثیہ تین بند سے آگے نہ بڑھ سکا اور یہیں پر غالبؔ نے انیسؔ و دبیرؔ کی قادر الکلامی اور عظمتِ فن کا اعتراف کر لیا۔ غالبؔ کے تحریر کردہ اردو مرثیے کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے:

ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو　　اے دجلۂ خوں چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قُم لبِ عیسیٰ سے رواں ہو　　اے ماتمیانِ شہِ مظلوم کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

شادؔ عظیم آبادی نے اپنی تصنیف پیمبرانِ سخن میں لکھا ہے کہ استادِ ذی کمال منشی امیر مرحوم نے دس بارہ برس میں سولہ سترہ مرثیے لکھے لیکن جب ایک مجلس میں انیسؔ سے ان کا نوتصنیف مرثیہ ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' سنا تو گھر جا کر اپنے تمام مرثیے اٹھائے اور دریا برد کر دیے۔

جدید ترین اردو تحقیق نے اردو کا پہلا مرثیہ گو شاعر عارف اور صوفی شاعر برہان الدین جانمؔ کو تسلیم کیا ہے جن کا زمانہ لگ بھگ ۹۵۰ ہجری کا ہے۔ تاہم اس صنفِ سخن میں اسی عہد کے قلی قطب شاہ اور عادل شاہ کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بہر طور یہ اٹل حقیقت ہے کہ میر انیسؔ اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے مرثیے کو اظہار کی ایسی قوت اور وسعت عطا کی ہے جو برسوں گزرنے کے بعد بھی اس کے مضامین کی چمک میں اس کے بعد آنے والوں کو نئی منزلیں دکھاتی ہے۔ انیس کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے مرثیے کو شاعری اور اردو ادب کی تاریخ میں موضوعِ بحث صنفِ سخن قرار دلوایا اسی لیے شبلی نعمانی کی موازنہ انیسؔ و دبیرؔ سمیت محمد حسین آزادؔ اور الطاف حسین حالیؔ جیسے عظیم لکھاریوں نے مرثیے کے باب میں نہایت سنجیدہ گفتگو کی ہے۔

زیادہ تر محققین کے مطابق انیسؔ نے پہلا مرثیہ ۱۸۲۱ میں ۱۹ برس کی عمر میں لکھا اور

پہلی مجلس لکھنؤ کے محلے نخاس میں میر ضمیرؔ اور میر خلیقؔ کی موجودگی میں پڑھی۔ اس وقت میر ضمیرؔ کی عمر ۵۴ برس تھی اور بقول ڈاکٹر اکبر حیدری یہ میر ضمیرؔ ہی کی طرزِ مرثیہ نگاری تھی جس پر بعد میں انیسؔ و دبیرؔ نے جدید مرثیے کا تاج محل تعمیر کیا۔

میں خود آج تک جدید اور قدیم مرثیے کی اصطلاحات کو سمجھ نہیں پایا کیونکہ میرے نزدیک صرف مرثیہ ہی نہیں بلکہ کوئی بھی ادب پارہ جس عہد میں لکھا جارہا ہو وہ اس عہد کے تقاضوں کے مطابق جدید ہی ہوتا ہے مگر یہاں بھی انیسؔ کے مراثی کو یہ کمال اور انفرادیت حاصل ہیں کہ یہ ہر عہد میں جدید مرثیے کی کسوٹی پر پورے اُترتے ہیں۔ آج انیسؔ کو جدید نہیں بلکہ قدیم یا پھر کلاسیک مرثیہ نگار کہنے والوں سے میں بصد احترام اتفاق نہیں کرتا کیونکہ میرے سامنے شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی کی یہ کسوٹی ہے ''جو مرثیہ تاسیِ حسین پر ابھارے وہ جدید ہے اور جو مرثیہ تاسیِ حسین پر نہ ابھارے وہ چاہے کیسے بھی جدید سے جدید ترین عہد میں لکھا جائے قدیم مرثیہ کہلائے گا۔'' یہ محلِ نظر رہے کہ حضرتِ جوشؔ نے یہاں تاسی حسین کو سیاسی معنوں میں نہیں بلکہ اسلام کی بنیادی اور حقیقی تعلیمات کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ میں نے مرثیے کے متعدد نقادوں کے ہاں مغربی اور مشرقی ادب اور ادیب اور خاص طور پر انیسؔ اور دبیر کے مرثیوں کا مغربی صنفِ سخن Elegy سے موازنہ کئی کئی مرتبہ پڑھا ہے اور میں اس تقابل کو سمجھنے سے اس لیے قاصر رہا ہوں کہ کیا ہمیں اپنے ہر کام کے لیئے مغرب کی سند درکار ہے۔ میرے نزدیک اردو مرثیے کی بنیاد یعنی واقعہ کربلا ایک اتنی قوی اور مستحکم بنیاد ہے کہ اس کی یکتائی اور عالمگیریت اردو مرثیے خاص طور پر انیسؔ کے مرثیوں کی عظمت کے لیے کافی ہے۔ اردو مرثیے نے براہِ راست کربلا سے اکتساب کیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اتنے بڑے اور یکتا واقعے کے بیان کے لیے مرثیے سے بہتر صنفِ سخن شاید اور کوئی نہ ہوتی۔ میرا یہ یقین کامل ہے کہ اردو مرثیے نے دراصل کربلا کی ابدی صداقت کے ذریعے اپنی صداقت قائم کی ہے۔ قلم کے ذریعے لفظوں کے کوّے ہنگانا شاعری نہیں ہے بازی گری ہے۔ لفظ صرف لفظ نہیں ہوتے لفظوں کو زندگی سے بھی بھرپور ہونا چاہئے۔ لفظ صرف الفاظ ہی نہ ہوں بلکہ ضرورت کے وقت پرواز بھی کریں۔ ان کا قد و قامت جذبے کی آنچ سے گھٹتا بڑھتا رہے۔ انیسؔ سے قبل یہ

الفاظ اردو کے بازار میں دھات سے بنے ہوئے سکے تھے۔ لیکن انیسؔ نے ان دھاتوں کو گلا کر پانی بنا دیا، لفظوں کے نئے محل تراشے اور ان کی نئی جہتیں مقرر کیں۔ انیس شناسی یا انیس فہمی ایک مکمل، وسیع اور الگ موضوع ہے جس پر اس مختصر وقت میں بات ممکن نہیں لیکن میں یہ ضرور عرض کرنا چاہوں گا کہ انیس کو سمجھنے کے لیے ایک خاص فضا سے گزرنا پڑتا ہے اور انیسؔ کو عمومی طور پر نہ جاننے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب تک واقعہ کربلا اور اس کے اسباب و نتائج کا مکمل علم نہ ہو انیسؔ کو سمجھنا ناممکن ہے اور اسی لاعلمی کا نتیجہ ہے کہ انیسؔ جیسا قادرالکلام شاعر زیادہ تر لوگوں کو مذہبی یا مسلکی شاعر لگتا ہے۔

اس بات سے انکار ناممکن ہے کہ ملکِ سخن کی بادشاہی اور تاجوری آج بھی انیسؔ کے پاس ہے اور اس کا سچا دعویٰ انیس نے برسوں قبل اس طرح کیا تھا کہ مقبولِ بارگاہ ایزدی ہوا۔

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیمِ سخن میری قلم رو سے نہ جائے

لگ بھگ دوسو سال گزرنے کے باوجود انیسؔ کی مرثیہ نگاری کی لاتعداد صفات ایسی ہیں جن پر ناقدین کی نگاہ ابھی تک نہیں پڑی۔ کلامِ انیسؔ اور مقامِ انیسؔ پر لکھنے کے لیے بلاشبہ اب بھی کئی صدیاں درکار ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم میں سے زیادہ تر افراد کو تو ابھی انیسؔ کے مکمل مرثیوں سے بھی آشنائی نہیں ہے۔

میں آخر میں یہ ضرور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خدائے سخن میر انیسؔ سے لے کر جوشؔ ملیح آبادی تک اور پھر جوشؔ سے عہدِ حاضر کے کئی نوجوان اور تازہ ذہن کے مرثیہ نگاروں تک کی شعری کاوشیں کسی بھی طور پر ادبِ عالیہ اور عالمی ادب کے موجودہ معیار سے کم نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دیگر مغربی اور مشرقی زبانوں میں ترجمے کے ماہرین کی خدمات سے استفادہ کیا جائے تاکہ برصغیر کی چار دیواری سے باہر بھی اس صنف عالیہ کی آواز بلکہ گھن گرج سنائی دے سکے۔ سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ اگر اہلِ ادب کے کچھ گروہ بابا بلھے شاہ، سچل سرمست اور امیر خسرو کو عالمی سطح پر کسی حد تک متعارف کرانے میں کامیاب ہو چکے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ اردو مرثیے کی محبت سے سرشار اذہان و قلوب

انیسؔ، دبیرؔ اور جوشؔ کو ادبائے عالم کے سامنے اس طرح پیش نہیں کر سکے جس سے ان عظیم مرثیہ نگاروں کے مقامی نہیں بلکہ عالمی قد کاٹھ کا اندازہ ہو سکتا۔ آج کے استدلالی دور میں صرف یہ کہہ دینا ہی کافی نہیں کہ ہمارا اردو مرثیہ عالمی ادب کے ہم پلہ ہے اور انیسؔ و دبیرؔ سے جوشؔ تک کے ہمارے مرثیہ نگار عالمی معیار کے شاعر ہیں بلکہ اس استدلال کو ثابت کرنے کے لیے جس فکری منصوبہ بندی کی ضرورت ہے وہ ہمارے ہاں ناپید ہے، لیکن اس صورتِ حال کے باوجود اگر اہلِ قلم حضرات اردو مرثیے کی عظمت، انفرادیت، تنوع اور دیگر محاسن کے بارے میں تحریر کرتے رہیں اور خصوصاً انگریزی، فارسی، عربی، فرانسیسی، جرمن اور دیگر غیر ملکی زبانوں میں ان کے تراجم عالمی معیار کے رسائل و جرائد میں شائع کرواتے رہیں تو بلاشبہ عالمی ادب کے اجارہ داروں کو ایک نہ ایک دن اس صنف کی عظمت کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔

کسی زمانے میں مرثیہ نہ کہہ سکنے والوں نے احساسِ کمتری کے باعث بگڑے شاعر کو جو مرثیہ گو قرار دیا تھا وہ رویہ آج بھی موجود ہے اور ادب دوستی کا دعویٰ کرنے والوں کی اکثریت اسے محض مذہبی، مسلکی اور عزا خانوں میں قید رکھنے کے حق میں ہے۔ میرا استدلال یہ ہے کہ اگر اس کی وجہ اور بنیاد صرف کربلا کا واقعہ اور امام حسینؑ ہیں تو یہ بذاتِ خود جاہل اذہان کی جہالت کی دلیل ہے کیونکہ واقعۂ کربلا اور امام حسینؑ کا تعلق کسی فرقے، مذہب یا تہذیب تک محدود نہیں بلکہ یہ تو وہ استعارے ہیں جو سارے زبانوں اور دنیاؤں کے لیے ہیں۔ یہ وہ روشنی ہے جس سے کوئی بھی فیض حاصل کر سکتا ہے۔ عزت سے زندہ رہنے کا وہ راستہ ہے جسے مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی، یہودی حتیٰ کہ بے دین بھی اپنا سکتا ہے۔

۲۱ ویں صدی کے در پر دستک دیتا مروجہ اصطلاح میں آج کا جدید مرثیہ بھی انیسؔ کی مرثیہ نگاری کا مرہونِ منت ہے اور سچ تو یہ ہے کہ دو سو سال پہلے کا مرثیہ نگار انیسؔ آج بھی اتنا ہی جدید اور تر و تازہ ہے جتنا ۱۹ ویں صدی کے آغاز میں تھا۔ مرثیہ اس پُر آشوب عہد میں بھی امن کی آواز اور احترامِ انسانیت و آدمیت کا پیغام ہے، مرثیے نے ہر وقت اور ہر زمانے کا ساتھ دیا ہے۔ مرثیے میں اُس کربلا نے اس کربلا تک کا صدیوں کا سفر ہے جو نہ

جانے اور کتنی صدیوں تک جاری رہے گا اور اس سفر کا تسلسل انیسؔ کے زندہ ہونے کی دلیل ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اردو ادب کے محسن میر انیسؔ کے بارے میں محسن کشی کا رویہ ختم کریں۔ موجودہ مواصلاتی انقلاب اور انٹرنیٹ جیسی سہولتوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اور ان کے مرثیوں کو مختلف بین الاقوامی زبانوں میں ترجمہ کر کے عالمی سطح پر متعارف اور مشتہر کرایا جائے تا کہ اس محسنِ اردو کا کچھ تو قرض ادا ہو سکے۔

تمہارے در پہ مجھے لائی جستجوئے ادب
انیسؔ تم ہی سے قائم ہے آبروئے ادب

ادب کی دنیا میں کوئی نہیں ترا ہمسر
ترے قلم سے سمندر بنی ہے جوئے ادب

انیسِؔ اردو تیرے سامنے صفدرؔ
کہے جو مرثیہ گو خود کو یہ ہے سوئے ادب

حجۃ الاسلام مولانا سید ذیشان ہدایتی

انیسؔ کی تاریخی اور فنّی عظمت

اردو زبان و ادب خصوصاً شاعری کی دُنیا میں انیسؔ کی تاریخی اہمیت بھی ہے اور تہذیبی بھی، فکری اہمیت بھی ہے اور فنّی بھی، ایک انتہائی طول طویل بحث کو بہت سمیٹ کر عرض کرنے کی کوشش کروں تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ذرا اِس بات پر غور کر لیجیے کہ اردو میں انیسؔ سے قبل اور انیسؔ کے بعد اَصنافِ شعر کے فنّی تقاضوں اور اُن کی درجہ بندی میں فی الجملہ کتنا نمایاں فرق پیدا ہُوا؟

انیسؔ سے قبل بلکہ انیسؔ تک کا دَور "بگڑا شاعر مرثیہ گو" کے تصور کا حامل نظر آتا ہے جبکہ انیسؔ اور اُن کے فوراً بعد کے دَور میں نہ صرف یہ کہ یہ تصور مردود قرار پا جاتا ہے بلکہ اس کی جگہ یہ تصور قائم ہو جاتا ہے کہ مرثیہ تو بس کوئی بڑا شاعر ہی کہہ سکتا ہے! یہ کسی معمولی درجہ کے شاعر کے بس کی بات نہیں۔ بلکہ بڑے شعرا میں بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ جیسا کہ غالبؔ جیسے بڑے شاعر کا اعترافِ عجز حالیؔ جیسے ثقہ راوی کی زبانی ہم تک پہنچا ہے۔

اردو مرثیہ کی تشکیل خصوصاً اُس کو اِس معیارِ عظمت تک پہنچانے میں یقیناً انیسؔ کے ساتھ دبیرؔ بھی اُن کے ہمگام و ہم دوش نظر آتے ہیں بلکہ اِن دونوں بزرگوارانِ ادب کے بزرگ مرتبہ اسلاف کی مسلسل ریاضتوں کا بھی اِس معیار کی تأسیس و تشکیل میں بڑا دخل ہے لیکن اگر ان تمام فنّی، فکری، تاریخی اور تہذیبی ریاضتوں اور روایتوں کے سلسلوں کو کسی ایک علامتی نام میں سمو کر پیش کیا جا سکتا ہے اور اُس نام کو اردو شاعری کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت دی جا سکتی ہے تو وہ بلا شبہہ انیسؔ ہی کا نامِ نامی ہو سکتا ہے۔

کسی نے تری طرح سے اے انیسؔ
عروسِ سخن کو سنوارا نہیں!

"مرثیہ" کو اتنی عظمت کس طرح ملی کہ اَب مرثیہ کہنا کسی معمولی درجہ کے شاعر کا تو کیا ذکر ہر اچھے اور بڑے شاعر کے بس کی بات بھی نہ رہی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تخلیقی زاویہ سے اِس میں فکر و تخیل، موضوع و مواد اور فن کے خارجی و ہیئتی سبھی عناصر تقریباً یکساں طور پر مؤثر ہوئے

ہیں۔ انیسؔ، اُن کے حریفِ میخانۂ سخن مرزا دبیرؔ اور ان کے معاصرین اور متبعین کے شاعرانہ فکر و تخیل نے اردو مرثیہ کے موضوع۔ ''کربلا''۔ کو جس طور پر ''اپنایا'' ہے اُس کا تجزیہ بجائے خود بہت تفصیلی بحث و گفتگو چاہتا ہے اور اس پر ہمارے بعض معتبر ناقدین نے متفرق طور پر سہی لیکن بہت کچھ لکھا بھی ہے۔

''اپنانے'' کی ایک جذباتی سطح ہوتی ہے ایک فکری، ایک محض تخیلاتی، اسی طرح ''اپنانے'' کی ایک صرف علمی سطح بھی ہوتی ہے جبکہ ایک زندہ، تہذیبی اور نامیاتی سطح بھی ہوتی ہے۔ ہمارے مرثیہ نگار شعرا نے کربلا کے موضوع کو اِن تمام سطحوں پر بہ اُحسن وجہ اور بہ احسنِ اسلوب اپنایا ہے! جس کی تصدیق کے لیے مراثی کے سرمایہ سے بھی اور اس کے زیرِ اثر پروان چڑھنے والی دوسری رثائی صنفوں مثلاً نوحہ، سلام، اور رثائی رباعیوں سے بھی —— اس کے علاوہ قطعاً غیر رثائی اصناف مثلاً غزل تک سے بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ بطورِ مثال ذرا اِن اشعار کو ملاحظہ فرمایئے:

فرات و کربلا سے پار ہو جا شہادت کے لیے تیار ہو جا

ہر سمت نیا حرملہ، ہر سمت نیا تیر پانی کی تمنا ہے تو حلقوم پہ کھا تیر

راستے میں ہو نہ جائے شام، چلنا ہے تو آ درمیاں ہے کوفۂ بدنام، چلنا ہے تو آ

دریا کے لاکھ ہاتھ مجھے روکتے رہے میں نے لگام اُٹھائی بہتر میں آ گیا

جذبہ تھا شوریدہ سر، دل تشنگی کا دشت ہے اور اصغر حرملہ کا تیر کھا کر رہ گیا!

(مظفر حنفی: پرچم گردباد)

یہ سلاموں سے نہیں غزلوں سے لیے گئے اشعار ہیں جو بغیر کسی تلاش و جستجو کے ہماری جدید شاعری کے صرف ایک مجموعۂ کلام کو اٹھا کر سرسری سی ورق گردانی کرنے سے سامنے آتے چلے گئے۔

(۳)

مرثیہ کے اِس قدر کارآمد اور مؤثر ہو جانے میں اس کے موضوع اور مواد کی اہمیت یقیناً تخیل و ہیئت کے جملہ داخلی و خارجی شعری و فنی عناصر کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے لیکن اس وقت

اِس کے تعلق سے کچھ کہنے کا موقع نہیں ہے۔ اس وقت تو عنوانِ بحث کی محدودیت کے پیشِ نظر صرف اردو مرثیہ کی ''فنّی جامعیت'' کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے تاکہ انیسؔ کے قبل اور انیسؔ کے بعد جو مرثیہ کے معیار میں عظیم فرق و تفاوت رونما ہوا اُس کی تھوڑی وضاحت اور ہو جائے جبکہ اِسی بحث میں خود انیسؔ کی ''فنّی عظمت'' کے شعری اسرار بھی پوشیدہ ہیں۔

''فنّی جامعیّت'' سے مُراد یہ ہے کہ جتنے بھی اصنافِ شعر و نظم اردو زبان میں فارسی کے ذخیرے سے آئے تھے ''انیسی مرثیہ'' نے اُن سب کو اپنے اندر جذب کرلیا اور اُس پر بہت کچھ اضافہ بھی کیا!

یہ رائے تنہا اِس حقیر کی نہیں ہے بلکہ اردو کے کئی معتبر نقاد مختلف الفاظ میں اس بات کا اظہار و اعتراف کر چکے ہیں۔

غالباً سب سے پہلا انتہائی بر جستہ اعتراف تو بقول معروف انیسؔ شناسی کے امامِ اوّل مولانا شبلی نعمانی کے یہاں ملتا ہے۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں:

> ''میرا ارادہ تھا کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تقریظ اور تنقید لکھی جائے جس سے اندازہ ہو سکے کہ اردو شاعری، باوجود کم مایگیء زبان، کیا پایہ رکھتی ہے۔ اس غرض کے لیے میر انیسؔ سے زیادہ کوئی شخص انتخاب کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا تھا کیوں کہ اُن کے کلام میں شاعری کے جس قدر اصناف پائے جاتے ہیں اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے!''
>
> (موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ، مرتبہ ڈاکٹر فضل امام ص ۱۹)

مولانا شبلی ہی کے دبستانِ سخن کے ایک اور نقاد مولانا عبد السلام ندوی صاحب شعر الہند لکھتے ہیں:

> ''اردو زبان میں مرثیہ گوئی سے پہلے رزمیہ شاعری کا گویا وجود نہ تھا، میر ضمیرؔ نے اس کی ابتدا کی، اور میر انیسؔ نے اس کو درجۂ کمال تک پہونچادیا، چنانچہ رزمیہ شاعری کا کمال جن جن امور پر موقوف ہے سب ان کے یہاں پائے جاتے ہیں''۔ (عبد السلام ندوی، شعر الہند ج ۲ ص ۱۶۲)

اسی طرح معروف انیسؔ شناسِ دیرینہ منشی امیر احمد علوی کاکوروی اپنی یادگار تصنیف ''یادگارِ انیس'' میں فرماتے ہیں:

''اُن کا پاکیزہ کلام بہترین اصنافِ سخن کا جامع ہے۔ اس میں ڈراما بھی ہے اور ایپک بھی، تشبیب و غزل بھی ہے اور رباعی و مسدس بھی.....''

(امیر احمد علوی یادگارِ انیس، ص ۲۰۱)

ہماری اردو تنقید کے سب سے بڑے پرستارِ انیسؔ مشہور اور بزرگ مرتبہ محقق، نقاد اور ادیب پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ مرحوم کی رائے بھی ملاحظہ فرمالیجیے:

''انیسؔ کا مرثیہ حقیقت میں ایک خاص طرح کی رزمیہ نظم ہے جس کی ترکیب میں مرثیت کا عنصر لازمی طور پر موجود رہتا ہے۔ اس نظم کا میدان مرثیے سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ بلکہ معنوی حیثیت سے شعر کی جتنی قسمیں کی جاسکتی ہیں، یہ اُن سب پر حاوی ہے۔''

(پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، روح انیس ص ۵۱)

اِن بزرگ مرتبہ، مستند سخن فہموں اور فن شناسوں، تنقید نگاروں کی رایوں کے ساتھ ایک دو نہیں بہت سے بالغ فکر و نظر کے حامل شعراء اور تخلیق کاروں کے احساسات بھی ہم آہنگ و ہم زبان ہیں۔ لیکن طوالت سے احتراز کرتے ہوئے میں صرف ایک پختہ شعور کے کامل شاعر جنہیں دبستانِ لکھنؤ کے نمائندگانِ متاخرین میں ممتاز حیثیت حاصل ہے حضرت عمر انصاریؔ کے ایک مسدس کا صرف ایک بند پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

''شرما گیا قصیدہ بھی چہرا جو لکھ دیا پہونچے گریز تک تو سرِ نظم خم مِلا
پہلو بدل کے بخش دی پھر مثنوی کو جا تکمیل تک تو سارا غزل ہی کا سامزا
ہر گل جہاں ملے، وہ چمن مرثیے میں ہے
ہو کوئی بھی وہ صنفِ سخن مرثیے میں ہے''

(عمر انصاری: (مسدس) ''طور سینا بے کلیم اللّٰہ منبر بے انیسؔ'' براءت لکھنؤ محرم ۱۳۹۷ھ ص ۶۴)

اِن تمام اقتباسات کے پیش کرنے کا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ انیسؔ کے مرثیے کی ''فنی جامعیت'' کا نظریہ کوئی میرا خود ساختہ نظریہ نہیں ہے اور یہ کہ انیسؔ اور اُن کے میخانۂ سخن کے حریفوں نے اپنے ریاضِ فن اور نشاطِ کار سے مرثیہ میں جو فنی جامعیت پیدا کی وہ بلا شک و شبہہ تاریخ شعر کا ایک انتہائی غیر معمولی اور بے سابقہ کارنامہ تھا۔

☆☆☆

پروفیسر سید اطہر رضا بلگرامی ☆

میر انیسؔ کے مرثیوں کی سماجیات

اعلیٰ ادبی تخلیق کے متعلق گوئٹے کا نظریہ ہے کہ کوئی صنف اس وقت تک عظیم نہیں بن سکتی جب تک اس کا موضوع عظیم نہ ہو۔ اگر گوئٹے کا یہ نظریہ سچ ہے تو پھر اردو شاعری کی اصناف میں مرثیہ ہی ایک ایسی صنف ہے، جس کے لیے یہ دعوہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا موضوع نہ صرف عظیم بلکہ عظیم تر ہے۔ لیکن اعلیٰ ادبی تخلیق کی عظمت جو اس کو آفاقی بنا دیتی ہے موضوع کی عظمت سے جس قدر جُزوی ہے اسی قدر اس موضوع کے پیش کرنے کے انداز اور سلیقہ سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ اس موضوع کو اردو زبان نے جو انداز اور سلیقہ دیا وہ نہ عرب میں عربی زبان دے سکی اور نہ ایران میں فارسی۔ سانحۂ کربلا عربی ادب میں بھی ہے اور فارسی ادب میں بھی لیکن اردو مرثیہ میں جس طرح یہ واقعہ اپنی تمام تر وسعتوں اور گہرائیوں کے ساتھ نظر آتا ہے اس کا کوئی عربی فارسی میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔

مرثیہ کے دکن تا اودھ ارتقائی سفر میں موضوع کی عظمت تو نہیں بدلی لیکن پیش کرنے کے انداز اور طریقے بدلتے رہے۔ مرثیہ اپنے ابتدائی عہد میں مقصدیت کے اعتبار سے انسانیت کے اعلیٰ سماجی، تہذیبی اور معاشرتی اقدار کا ترجمان نہیں تھا۔ وہ محض حصولِ ثواب کی خاطر کہا جاتا تھا اور پڑھا بھی جاتا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد امام حسین کی مظلومیت اور ان کے رفقاء کے مصائب بیان کر کے خود بھی رونا اور دوسروں کے لیے رونے کے مواقع فراہم کرنے تک محدود تھا۔ اس لیے مرثیہ گوئی کی اس بنیادی مقصدیت کے پیچھے خیر وشر کی جو سطحیں پوشیدہ تھیں ان کو ابھارا نہیں جا سکا۔ کربلا کے واقعہ میں ایک طرف انسانیت ظلم و ستم، جبر و تشدد اور بہیمیت و بربریت کے بدترین نمونوں کی صورت میں نظر آرہی تھی اور دوسری طرف اس کے مقابلہ میں مظلومیت، صبر و تحمل، ایثار جیسی انسانی اعلیٰ ترین صفات

☆ پروفیسر شعبۂ معاشیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

کے ذریعہ پست ترین کرداروں کو جواب دیا جارہا تھا۔ اس خیر و شر کے تصادم کا لازمی نتیجہ براہِ راست انسانیت کی عظمت اور تہذیب و ثقافت کے بلند مرتبوں کی نشاندہی کی شکل میں رونما ہوا۔ اودھ تک پہنچتے پہنچتے مرثیہ انسانیت کی ان بلند اقدار کا نقیب بن گیا اور میر انیسؔ نے ان اقدار کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔ کسی ملک میں ادب کے وہی اجزاء پنپ سکتے ہیں جو اس ملک کی روایت، تاریخی تسلسل، عوام کی نفسیات اور سماجی معاشرتی اور اخلاقی قدروں سے ہم آہنگی رکھتے ہوں۔ انیسؔ کے مرثیوں کو اعلیٰ ادبی تخلیق کا یہ رتبہ انہیں عناصر کی مدد سے ملا۔ انہیں کی مدد سے مرثیہ آفاقی قدروں کا نقیب بنا جو ایک عہد کا پابند ہوتے ہوئے رنگ و نسل، فرقہ، گروہ، علاقے اور ہر طرح کے توہمات سے بلند و بے نیاز ہو کر وسیع انسانی اقدار پیش کرتا رہا۔

ان اعلیٰ سماجی، معاشرتی اور تہذیبی اقدار کو تمام تر وسعتوں اور گہرائیوں کے ساتھ ابھار کر نقطہ کمال تک پہنچانا اور ان کو آفاقیت عطا کر دینا انتہائی مشکل کام تھا جس کو میر انیسؔ نے بہ حسن و خوبی پورا کیا۔ اس کے لیے ادیب کی حسیت اور شعور کی بالیدگی سہارا بنی اور پھر ہندوستان کی تاریخ، قومی مزاج، اس کی تہذیبی اور معاشرتی قدروں نے بھی بڑھ کر سہارا دیا۔ ایک ادیب بھی سماج کا اسی طرح رکن ہوتا ہے جس طرح دوسرے لیکن فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد میں، دوسروں کے مقابلہ، بہتر شعور و حسیت رکھتا ہے اور اس عہد کی خصوصیات سے متاثر ہوتا ہے، اپنے عہد کے کرب کو جھیلتا ہے اور اپنی تخلیقات میں ان کو کبھی براہ راست اور کبھی اشارتاً و کنایتاً اور علامتی انداز سے پیش کرتا رہتا ہے۔ [1] ہندوستان کی ہزارہا سال کی تاریخ، یہاں کا مزاج اور تہذیبی قدریں، عرب و ایران کے مقابلہ، کربلا کے موضوع کی آفاقی قدروں کو ابھارنے کے لیے انتہائی سازگار ثابت ہوئیں اور ہندوستان کو بھی میر انیسؔ جیسا حساس و باشعور شاعر ملا جس نے ان قدروں کو آفاقیت بخش کر مرثیہ کو عالمی ادب سے آنکھ ملانے کے قابل بنا دیا۔ میر انیسؔ کے حساس اور باشعور ذہن نے بخوبی سمجھا کہ رامائن ہو یا مہابھارت، بھائی بھائی سے محبت، بہن بھائی کی الفت، ماں اور بیٹے کی محبت، دوستوں کی وفاداری، آغاز شباب میں

---

(۱) ڈاکٹر شارب ردولوی، انیسؔ کے مرثیوں کا سماجیاتی مطالعہ

بہادری، احسان، حیا، اطاعت، مہر و وفا، امیری، غریبی اور ہر موڑ پر خیر وشر کے تصادم میں قوت خیر کے ساتھ ہمدردیوں کے اعلیٰ ترین نمونے یہاں یکجا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے عوام نے جب کربلا کے واقعات سنے تو انہیں یہ واقعات اپنے مزاج اور نفسیات سے ہم آہنگ نظر آئے۔ یہاں کے عوام تو غریب الوطنی کے کرب سے واقف ہیں۔ بن باس کے کرب اور تڑپ کو کون نہیں جانتا، اسیری کے درد سے کون واقف نہیں، خاکساری، تواضع اور انکساری کے ساتھ شجاعت کے جوہر کے مظاہروں سے کون آگاہ نہیں ہے۔ ہندوستان کے مزاج نے بتلا دیا کہ میدانِ جنگ میں دشمن کو زیر کر لینا بہادری نہیں بلکہ دوسروں کی جان بچانا، نظریات و اصول کے خاطر جان پر کھیل جانا شجاعت ہے۔ یہ وہ اعلیٰ قدریں ہیں جنہوں نے میر انیسؔ کو سہارا دیا۔ (۲)

کربلا کے واقعات میں پنہاں ان اعلیٰ قدروں کا یہ ثبوت ہے کہ بقول پرفیسر ہارون رشید شیروانی ''امام حسین اور ان کی شہادت کے واقعات مقامی اثرات اور مقامی جذبات کے تحت اضافے اور ترمیمات کے ساتھ آج بھی رائل سیما اور آندھرا پردیش کے علاقوں میں کسان اپنا ہل چلاتے، کمہار اپنا چاک ہلاتے اور جلاہا اپنا کپڑا بنتے ہوئے گاتا ہے۔ انھیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ ان گیتوں کے ہیرو باہر کس دیس کے رہنے والے تھے۔ (۳) کربلا کے واقعات ہندوستان کے عوام وخواص کی زندگی کو اس قدر متاثر کر چکے تھے کہ کسی طرح کا احساس اجنبیت وغیریت باقی نہیں رہا اور میر انیسؔ نے اسی اپنائیت اور یگانگت کی بھرپور عکاسی اپنے مرثیوں میں کی ہے۔

آرنلڈ نے کسی مقام پر POWER OF THE MOMENT AND POWER OF THE MAN کی بات کی ہے جس کو ہم اپنی زبان میں ''قوتِ عصر'' اور ''قوت فرد'' کا نام دے سکتے ہیں۔ قوت عصر سے مراد کسی مخصوص عہد اور سماج کے رسم ورواج، توہمات اور مطالبات ہیں اور قوتِ فرد کا مطلب شاعر کی تخیل آفرینی، جدّت طرازی، حسّیت اور

---

(۲) مجیب رضوی، اودھ کے دو عظیم شاعر: تلسی داس اور میر انیسؔ

(۳) ڈاکٹر مجاور حسین رضوی، اردو مرثیہ کے غیر مسلم شعراء، ''اردو مرثیہ'' مرتبہ ڈاکٹر شارب ردولوی، اردو اکیڈمی دہلی ۱۹۹۱ء

انفرادیت ہے۔ یہ دونوں قوتیں مل کر ادب کی تخلیق کرتی ہیں اور ان دونوں قوتوں کے امتزاج سے اعلیٰ ادب وجود میں آتا ہے۔ اگر قوتِ عصر قوتِ فرد پر غالب آجائے تو ادب کا تخلیق کا روقت کے ساتھ بہہ جاتا ہے جس کو آج کل کی اصطلاح میں فیشن یا فارمولا کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر قوتِ فرد قوتِ عصر پر غالب آگئی تو تخلیق کا روقت کے مطالبات پورے نہیں کر پاتا اور نتیجہ میں اس کی تخلیقات انتہا پسندی اور خود مرکزیت کا شکار بن جاتی ہیں۔ میر انیسؔ کے مرثیوں میں قوت عصر اور قوت فرد کا بہترین، اعلیٰ اور کامیاب امتزاج نظر آتا ہے [۴]۔ اور اسی اعلیٰ امتزاج نے میر انیسؔ کے مرثیوں کو عالمی ادب کی صف میں شامل کیا۔

میر انیسؔ نے اپنے مرثیوں میں ہندوستان کے مزاج اور اپنے عہد کی جاگیردارانہ تہذیب و معاشرت دونوں کو خوبصورتی سے یکجا کر دیا۔ شجاعت، سخاوت، خاکساری، تواضع اور انکساری کے کچھ نمونے ملاحظہ کیجئے۔ یہ ہندوستان کی اعلیٰ قدروں کے نمونے ہیں:

شجاعت کا معیار

سوکھے لبوں پہ حمدِ الٰہی رخوں پہ نور   خوف و ہراس و رنج و کدورت دلوں سے دور
فیاض، حق شناس، اولوالعزم، ذی شعور   خوش فکر، بذلہ سنج، ہنر پرور و غیور

کانوں کو حسن صوت سے حظ برملا ملے
باتوں میں وہ نمک کہ دلوں کو مزا ملے

ساونت، بردبار، فلک مرتبت دلیر   عالی منش، سبا میں سلیماں، وفا میں شیر
گردانِ دہران کی زبردستیوں سے زیر   فاقوں میں دل بھی، جسم بھی اور نیتیں بھی سیر

دنیا کو ہیچ و پوچ سراپا سمجھتے تھے
دریا دلی سے بحر کو قطرہ سمجھتے تھے

سخاوت کا معیار ملاحظہ کیجیے:

---

(۴) ڈاکٹر شارب ردولوی، انیس کے مرثیوں کا سماجیاتی مطالعہ،" اردو مرثیہ" مرتبہ ڈاکٹر شارب ردولوی، اردو اکیڈمی دہلی ۱۹۹۱ء

گرچہ یہ امر نہیں اہلِ سخا کے شایاں　　کہ کسی شخص کو کچھ دے کے کرے سب پہ عیاں
پوچھ لو، حُر تو ہے موجود، عیاں راچہ بیاں　　اسی جنگل میں معِ فوج تھا یہ تشنہ وہاں
شور تھا آج چلیں جسم سے جانیں سب کی
منہ سے باہر نکل آئی تھیں زبانیں سب کی

زیست ہر شے کی ہے پانی سے، شجر ہو کہ بشر　　مجھ سے دیکھا نہ گیا میں تو سخی کا ہوں پسر
میں نے عباس دلاور سے کہا گھبرا کر　　مشکوں والے ہیں کہاں، اونٹ ہیں پانی کے کدھر
کرمِ ساقیِ کوثر کو دکھا دو بھائی
جتنا پانی ہے وہ پیاسوں کو پلا دو بھائی

اور پھر اس سخاوت کا اثر بھی ملاحظہ کیجیے:

مجرم ایسا ہوں کہ عصیاں کا نہیں جس کے شمار
عفو کر، عفو کر، اے چشمۂ فیضِ غفار
اے مددگار معین الضغفا ادرکنی　　اے خبر گیرِ گروہ غرباء ادرکنی
پاؤں لغزش میں ہیں اے دستِ خدا ادرکنی　　ہاتھ باندھے ہوں میں اے عقدہ کشا ادرکنی
دیجیے حُر کو سند۔ نار سے آزادی کی
آیئے جلد خبر لیجیے فریادی کی

باطل سے حق کی طرف پلٹنے کی روایت ہندوستانی تاریخ کا حصہ ہے جہاں سخی کی سخاوت کا اعلیٰ معیار معاف کرنے اور اس پر محبت وعنایت کی برکھا کرنے سے قائم ہوتا ہے۔ رحمت عالم کے نواسے نے حُر کو نہ صرف معاف کیا بلکہ:

خود بڑھے ہاتھوں کو پھیلائے شہنشاہ اُمم

اور پھر:

حُر نے دیکھا کہ چلے آتے ہیں پیدل شبیر　　دوڑ کر چوم لیے پائے شہِ عرش سریر
شہ نے چھاتی سے لگا کر کہا، اے باتوقیر　　میں نے بخشی، مرے اللہ نے بخشی تقصیر
میں رضا مند ہوں کس واسطے مضطر ہے تو
مجھ کو عباسِ دلاور کے برابر ہے تو

خاکساری اور انکساری کا انتہائی پُر اثر اور دلکش نمونہ دیکھیے ۔ امام حسین کے سب یار و مددگار شہید ہو چکے ہیں اور وہ خود جہاد کرتے کرتے شہادت کی آخری منزل کے قریب ہیں ۔ اس وقت ایک مسافر کا میدان کربلا میں گزر ہوتا ہے جوان کی مظلومی اور حوصلہ و صبر دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے اور پوچھتا ہے آپ کون ہیں؟ جواب میں امام حسین :ع یہ تو نہ کہہ سکے کہ 'شہِ مشرقین' ہوں بلکہ ع مولا نے سر جھکا کے کہا ''میں حسین ہوں''۔ دبیرؔ نے بھی اس واقعہ کو نظم کیا اور کہا: ''فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں''۔ حسین کے اپنے منہ سے ''علیہ السلام'' کہنے میں وہ انکساری نہیں جھلکتی جو سر جھکا کے صرف ''میں حسین ہوں'' کہہ دینے سے جھلکتی ہے۔ (۵)

تہذیب و معاشرت کی بنیاد خاندان کے رشتوں کی آپسی محبت اور پاسداری پر ٹکی ہے ۔ یہ محبت و پاس داری ہندوستان کی شناخت ہے جس میں صدیوں کی تہذیب کا رچاؤ، اسلام کی تعلیم کا نچوڑ، انسانیت کا درد، ایثار و محبت پوشیدہ ہے ۔ میری انیسؔ کے ہر مرثیہ میں اس کے دل کش اور دل گداز منظر مل جائیں گے ۔ اس کا تفصیلی جائزہ لینا اس مضمون میں محال ہے اس لیے نہایت اختصار کے ساتھ اشارتاً چند بند ملاحظہ کیجئے ۔

حضرت عباس امام حسین کے چھوٹے سوتیلے بھائی تھے جن کی پرورش و تربیت ماں نے کچھ اس انداز سے کی تھی کہ وہ حسین پر دل و جان سے فریفتہ تھے:

یہ جس طرح تھے شیفتۂ شاہِ نامدار پروانہ یوں چراغ پہ ہوتا نہیں نثار

اور پھر: عزت تھی خادمی میں غلامی میں افتخار

الفت اسی طرح تھی انہیں اپنے شاہ سے
جو عشق تھا علی کو رسالت پناہ سے

روز عاشورہ جب سارے جاں نثار شہید ہو چکے اور صرف اکبر و عباس باقی ہیں تو عباس میدان جنگ میں جانے کی اجازت لینا چاہتے ہیں، بچوں کے لیے پانی لانا چاہتے ہیں، مگر حسین جدائی کا بہانا سمجھتے ہوئے رخصت کی اجازت نہیں دیتے ۔ اس وقت حضرت عباس بہن زینب کے پاس آکر فریاد کرتے ہیں:

---

(۵) بیگم صالحہ عابد حسین، کلام انیس اور اخلاقی قدریں۔

پردے سے لگی رو رہی تھیں زینب ناچار
ہمشیر کے قدموں پہ گرے دوڑ کے اک بار

اور پھر جب امام حسین حضرت عباس کو اجازت دے دیتے ہیں تو بھائی کی جدائی میں، بیقراری کے عالم میں ان کے منہ سے جو جملے نکلتے ہیں وہ ملاحظہ کیجیے:

مشہور کائنات میں ہے بھائیوں کا پیار   بچپن سے میں ہوں اس پہ فدا، مجھ پہ یہ نثار
پہلو میں دل نہ ہو، تو جگر کو کہاں قرار   مجھ سے جدا ہوا نہیں دم بھر یہ نامدار
بولا نہیں میں کچھ ، جو بھرا گھر اجڑ گیا
مر جاؤں گا ابھی، جو یہ بھائی بچھڑ گیا[۶]

بھائی بہن کی محبت ہر ملک اور ہر قوم کی تہذیبی و معاشرتی اساس ہے لیکن میر انیسؔ نے زینب اور حسین کی محبت کو جس مقام تک پہنچا دیا ہے وہ تاریخ انسانی کا بے مثل نمونہ ہے۔ جو بہن اپنے بیٹوں کو بھائی پر قربان کر دے اور ماتھے پر شکن نہ آئے تو ایسی محبت و ایثار کے لیے دلیلیں دینے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ انیسؔ نے اپنے متعدد مرثیوں میں حضرت زینب اور امام حسین کی محبت کی ایسی مرقع کشی کی ہے جس کا جواب شاید ہی دنیا کا کوئی ادب دے سکے۔ زینب کے دونوں بیٹوں کی لاشیں خیمہ میں آتی ہیں لیکن وہ ان کو دیکھنے سے گریز کرتی ہیں:

آنچ آتما کی دل کو جلائے تو کیا کروں
گر فرق میرے صبر میں آئے تو کیا کروں

یہی صابر زینب بھائی کی جدائی کے وقت اپنا سارا صبر و قرار کھو بیٹھتی ہے۔ ایسے بھائی کی جدائی کی تصویر کشی کرنا صرف انیسؔ جیسے حساس شاعر کا ہی کام ہے:

پُرخوں جبیں، پھٹے ہوئے کپڑے، بدن پہ خاک   چادر سیاہ ، ایک گریباں ، ہزار چاک
سر بھی جگر بھی، سینۂ پرخوں بھی دردناک   بیکس بہن کے حال پہ روئے امام پاک[۷]

یہ چند اقتباسات ہندوستان کی اعلیٰ تہذیبی و معاشرتی قدروں کی نمائندگی میں پیش کیے گئے۔ میر انیسؔ ایک مخصوص عہد کی نمائندگی بھی کر رہے ہیں اور وہ ہے اودھ کا جاگیر

---
(۶) ایضاً   (۷) ایضاً

دارانہ نظام جس کی تہذیب و معاشرت، رسم و رواج، زبان و محاورات، اعتقادات اور سیاسی اتھل پتھل (بحران) سبھی کا بھرپور عکس ان کے مرثیوں میں جھلکتا ہے، ان عناصر کی جزویاتی تفصیلات، جس گہرائی و گیرائی کے ساتھ میر انیسؔ کے مرثیوں میں ملتی ہیں، اس سے شاعر کی حیثیت اور شعور کی بلندی کا احساس ہو جاتا ہے۔ میر انیس کا کوئی مرثیہ پڑھیے، آپ کو اودھ کی تہذیب و معاشرت کی مختلف سطحوں کا احساس نمایاں ہو جائے گا۔ جاگیر دارانہ تہذیب، دربار کے آداب، اس وقت کے اعلیٰ، اعلیٰ اوسط طبقے اور مسلم معاشرے کی قدریں، ہر طبقہ کی رسوم، معتقدات اور توہمات اپنی تمام تر جزویات کے ساتھ واضح ہو جائیں گی۔ میر انیسؔ کے مرثیوں کی توانائی، دلکشی اور اثر آفرینی اس عہد کی اسی آئینہ داری میں مضمر ہے۔ ان مرثیوں میں جو اس عہد کی سماجی، تہذیبی و معاشرتی زندگی کی تصویریں ملتی ہیں وہ کہیں تو امام حسین اور انصار حسین کی گفتگو سے ظاہر ہوتی ہیں اور کہیں عورتوں اور بچوں کی گفتگو سے۔ جاگیر دارانہ نظام میں حفظ مراتب کا بڑا لحاظ ہے۔ تہذیب کے اس عنصر کو تمام جزویات کے ساتھ ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے۔'' میں پڑھیے جہاں عون و محمد کی اپنی والدہ حضرت زینب سے گفتگو اس پس منظر میں پیش کی گئی ہے جب حضرت عباس کو فوجِ حسینی کا نشان (علم) دیا جانا طے کیا گیا۔ تہذیب کی اس تصویر کا ایک دوسرا انتہائی اندوہ ناک رخ بھی دیکھیے جب عون و محمد کی لاشیں خیمۂ حسینی میں لائی جاتی ہیں تو حضرت زینب گریا کرتی ہوئی فرماتی ہیں:

یہ بے حجابیاں شہِ والا کے سامنے
پھیلا کے پاؤں سوتے ہو آقا کے سامنے (۸)

جاگیر دارانہ نظام کی جھلک: ''فرزند پیمبر کا مدینے سے سفر ہے'' میں دیکھیے جس میں امام کی رخصت کا اہتمام پیش کیا گیا ہے۔ اس منظر کی جزویات پر غور کیجیے۔ پورے ماحول میں حفظِ مراتب، کرداروں کے درمیان بڑا اہتمام اور بھاگ دوڑ نظر آتی ہے جس نے شان و شوکت و شکوہ کو پورے طور پر اجاگر کر دیا ہے۔

حاضر درِ دولت پہ ہیں سب یاور و انصار　　کوئی تو کمر باندھتا ہے اور کوئی ہتھیار

---

(۸) ڈاکٹر شارب ردولوی، انیس کے مرثیوں کا سماجیاتی مطالعہ

ہودج بھی کسے جاتے ہیں محمل بھی ہے تیار چلاتے ہیں درباں کوئی آئے نہ خبردار
ہر محمل و ہودج پہ گھٹا ٹوپ پڑے ہیں
پردے کی قناطیں لیے فراش کھڑے ہیں

بیت الشرف خاص سے نکلے شہِ ابرار روتے ہوئے ڈیوڑھی پہ گئے عترتِ اطہار
فراشوں کو عباس پکارے یہ بہ تکرار پردے کی قناتوں سے خبردار، خبردار
باہر حرم آتے ہیں رسول دوسرا کے
شقہ کوئی جھک جائے نہ جھونکے سے ہوا کے

لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو وہ اتر جائے آتا ہو اِدھر جو وہ اسی جا پہ ٹھہر جائے
ناقے پہ بھی کوئی نہ برابر سے گزر جائے دیتے رہو آواز جہاں تک کی نظر جائے
مریم سے سوا حق نے شرف ان کو دیے ہیں
افلاک پہ آنکھوں کو ملک بند کیے ہیں

پہنچی جو ہیں ناقے کے قریں دخترِ حیدر خود ہاتھ پکڑنے کو بڑھے سبط پیمبر
فضہ تو سنبھالے ہوئے تھی گوشۂ چادر تھے پردۂ محمل کو اٹھائے علی اکبر
فرزند کمربستہ چپ و راست کھڑے تھے
نعلین اٹھا لینے کو عباس کھڑے تھے

اور جب یہ قافلہ کربلا پہنچا تو پھر سواریوں کے اترنے کا اہتمام: ع۔ جب کربلا میں داخلۂ شاہ دیں ہوا میں دیکھیے

بولے یہ ہاتھ جوڑ کے عباسِ نامور خیمہ کہاں بپا کریں یا شاہ بحر و بر

امام نے جواب دیا:

زینب جہاں کہیں وہیں خیمہ کرو بپا

پیچھے ہٹے، یہ سنتے ہی عباس باوفا جا کر قریب محملِ زینب یہ دی صدا
حاضر ہے جاں نثار امام غیور کا
برپا کہاں ہو خیمۂ اقدس حضور کا

اور جب حضرت زینب انہیں جگہ طے کرنے کا اختیار دے دیتی ہیں تو اہتمام دیکھیے:

یہ سن کے خادموں کو پکارا وہ مہ جبیں فراش آکے جلد مصفّٰی کریں زمیں
حاضر ہوں آب پاش محل دیر کا نہیں یاں ہوگا خیمۂ حرم بادشاہِ دیں
جلد ان کو بھیجو لوگ جو ہیں کاروبار کے
لے آؤ اشتروں سے قناتیں اتار کے

اور جب اسی درمیان لشکر شام وہاں پہنچتا ہے تو حضرت عباس ملازموں سے کہتے ہیں:

دریافت تو کرو کہ ارادہ ہے ان کا کیا
آتے ہی سرکشی یہ طریقہ ہے کونسا کہہ دو کہ اہل بیت کے خیمے کی ہے یہ جا

کرسی نشیں ہے لختِ دل سید البشر آئینِ خسروی سے یہ واقف نہیں مگر
آتی ہے اڑ کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے گرد ادھر کیا ہے جو روکتے نہیں باگیں یہ خیرہ سر
پھولے ہوئے ہیں اس پہ کہ ہم خاکسار ہیں
شاید ہوا کے گھوڑے پہ ظالم سوار ہیں

میر انیسؔ کے ان بندوں میں، دربان، فراش، محمل، قناتیں، آقا، غلام، عورتوں کے سوار ہونے کے لیے گوشۂ چادر کو سنبھال کر کھڑے ہونا، لڑکوں کو بھی کوٹھے سے اتر جانے کا حکم، دور دور تک آنے جانے والوں پر روک، خبردار، ہوشیار کی آوازیں، آداب خسروی کا ذکر، کرسی نشیں ہونے کی خبر دینا، بچوں کا دست بستہ کھڑا ہونا، عباس کا نعلین اٹھانے کے لیے مستعد رہنا، ہاتھوں کا سہارا دے کر خواتین کو سواری پر بٹھانا، یہ سب جاگیردارانہ معاشرے کا اہم ترین حصہ ہیں، اس عہد کی سماجی اور تہذیبی اقدار ہیں جن سے میر انیسؔ تعلق رکھتے تھے اور اسی لیے ان اقدار کی تمام جزویاتی تصویرکشی کرنے پر قادر تھے۔ (۹)

اس عہد کی تہذیب و معاشرت کا ایک رخ دیکھیے۔ علم نہ ملنے پر حضرت زینب کے بچوں کو جو صدمہ تھا اس کا احساس حضرت زینب کو تھا لیکن بچوں کے ملال کو کیسی نصیحت و تنبیہ میں ڈھال دیا، اس کا نمونہ: ع ''جاتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج'' سے مکالمہ کی شکل میں دیکھیے:

---

(۹) ایضاً

پھر کر ادھر سے ماں نے جو بیٹوں پہ کی نظر سمجھیں علم نہ ملنے سے بے دل ہیں یہ قمر
ہٹ کر کیا اشارہ کہ آؤ ذرا ادھر آئے عقب سے شہ کے، سعادت نشاں پسر
بولیں کہ اب نہ ہوش نہ مجھ میں حواس ہیں
قربان جاؤں کیا ہے جو چہرے اداس ہیں
پردا ہے تو سناؤ الگ چل کے دل کا حال دونوں نے عرض کی کہ نہیں، کچھ نہیں ملال
ہاں ہم کو آج بھول گئے شاہِ خوش خصال اوروں کی پرورش ہے، ہمارا نہیں خیال
کیا ورثہ دارِ جعفر طیار ہم نہ تھے
اس عہدۂ جلیل کے حقدار ہم نہ تھے

بچوں کے احساسات شاید تہذیبی سرحدوں کو پار کر رہے تھے کہ حضرت زینب نے کہا:

انگشت رکھ کے دانتوں میں ماں نے کہا کہ "ہا" اب اس کا ذکر کیا ہے جو ہونا تھا ہو چکا
دیکھو سنیں نہ زوجہ عباسِ باوفا اچھا یہ ہے خوشی کی جگہ یا گلے کی جا
غصہ نہ اس میں چاہئے جو امر خیر ہو
واری وہ کون غیر ہیں تم کون غیر ہو
لو اپنے دودھ کی تمہیں دیتی ہوں میں قسم اب کچھ کہو گے منہ سے تو ہوگا مجھے بھی غم
سنتے تھے تم جو کہتے تھے عباس ذی حشم دو جا کے ان کو تہنیتِ عہدۂ علم
صدقے گئی خلاف ادب کچھ سخن نہ ہو
میری خوشی یہ ہے کہ جبیں پر شکن نہ ہو
کنبے میں ایک نے بھی اگر سن لیا یہ حال کہتی ہوں صاف میں مجھے ہوگا بہت ملال

اب بچوں کی تعظیم دیکھیے:

ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولے وہ نونہال ہم باوفا غلام ہیں کیا تاب کیا مجال
دیجے ہمیں سزا جو بل ابرو پہ پھر پڑیں
کہیے تو چھوٹے ماموں کے قدموں پہ گر پڑیں (۱۰)

میر انیس کے عہد کے سماجیاتی مطالعہ میں رسم و رواج، توہمات، اعتقادات کے

(۱۰) ایضاً

اظہار کی قوتیں انتہائی شدید ہیں۔ وہ تمام مرثیے جن میں حضرت قاسم کی شادی اور ان کی شہادت کا بیان ہے وہاں ہندوستان بالخصوص اودھ کے توہمات واعتقادات پورے طور پر روشن ہیں اور مرثیہ کی پوری فضا کو بدل دیتے ہیں۔ ان مرثیوں میں بلائیں لینا، کسی کے گرد پھرنا یعنی صدقے ہونا، مانگ کوکھ سے ٹھنڈی رہنے کی دعا دینا، سندل سے مانگ بھرنا، ہاتھ پاؤں میں مہندی ملنا، تاروں کی چھاؤں میں دلہن کو لانا، کنکھیوں سے نظر ڈالنا، بہنوں کا آنچل ڈالنا، بال نوچنا، افشاں چھڑانا، منہ پر خاک ملنا، سہرہ بڑھانا، رانڈ کو سفید چادر اڑھانا وہ رسوم وتوہمات ہیں جو سماج کے ناگزیر اُصول کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے بیان کے بغیر معاشرتی ڈھانچہ چرمرا کر رہ جاتا ہے۔ انیس کو ان کی اہمیت کا پورا احساس تھا۔ ہندوستانی معاشرت میں رنڈاپا کتنا اندوہناک ہے اس کی تصویر کشی دیکھیے:

کہہ کے یہ کھول دیئے گوندھے ہوئے سر کے بال ۔۔۔ خاک پر ماتھے سے سہرے کو دیا توڑ کے ڈال
کہتی تھی رو کے یہ اے سید مسموم کے لال ۔۔۔ تم ہوئے قتل ملا خاک میں میرا اقبال

بدتر از موت ہے مجھ رانڈ کا جینا صاحب
کس طرح کاٹوں گی بچپن کا رنڈاپا صاحب

شوہر کے مرنے پر عورت کا سماجی معیار، اس کا اقبال کس طرح گرتا ہے دیکھیے:

تم نے تو قتل کے میداں میں کٹائی گردن ۔۔۔ سمجھیں گے اب مجھے بے وارث وبیکس دشمن
باندھیں گے کنگنے کی جا دستِ حنائی میں رسن ۔۔۔ کوفہ وشام میں سر ننگے پھرے گی یہ دلہن

سرِ عریاں پہ ردا لا کے اُڑھا دے گا کون
قید سے آپ کی بیوہ کو چھڑا دے گا کون

اور پھر جب رنڈسالے کا جوڑا آیا:

سامنے لا کے جو رنڈسالے کا جوڑا رکھا ۔۔۔ پیٹ کر سینہ و سر کہنے لگی تب کبرا
صاحبو اس کو پنہانے سے کہو فائدہ کیا ۔۔۔ رو کے تب مادرِ ناشاد نے بیٹی سے کہا

رسم دنیا کی ہے اے بیکس وغم ناک یہی
پہنو صدقے گئی رانڈوں کی ہے پوشاک یہی (۱۵)

---

(۱۵) ایضاً، سید غوث، مراثی انیس میں اخلاقی قدریں، محمد سیادت نقوی، اردو مرثیہ کی ثقافتی اہمیت، بیگم صالحہ عابد حسین، کلام انیس اور اخلاقی قدریں

کسی ملک کی سیاسی سرگرمیاں، اتھل پتھل اور انقلابات معاشرے کی فکر اور اس کی اقدار کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ معاشرہ مایوسیوں کا شکار بھی ہوتا ہے اور ان سے توانائی بھی حاصل کرتا ہے۔ میر انیسؔ نے اودھ کا زوال بھی دیکھا اور ۱۸۵۷ کے غدر کی تمام تہذیبی و معاشرتی تباہ کاریاں بھی دیکھیں اور انہیں جھیلا بھی۔ انیسؔ جیسے شاعر نے سیاسی بحرانی کیفیت کو کس شدت سے محسوس کیا اس کی کچھ جھلکیاں ان مصرعوں میں دیکھیے:

وہ کہتا تھا کہ کوفہ میں عجب غدر ہے مولا ہر سمت میں قضیے تو فساد اٹھتے ہیں مولا

یا جب دیکھیے دوڑیں چلی آتی ہیں گھروں یا

اشراف ہیں جتنے وہ نکلتے نہیں گھر سے دروازے نہیں کھولتے لُٹ جانے کے ڈر سے

ہو جاتی ہے جب شام تردد میں سحر سے سب کرتے ہیں سجدے کہ بلا ٹل گئی سر سے

یا آفت ہے محلوں پہ بپا، بند ہیں بازار یا

کوچے بھی اجڑ جانے سے بے ربط ہوئے ہیں جو بھاگ گئے تھے سب ان کے مکاں ضبط ہوئے ہیں

یا

کچھ خوف سے مخفی ہیں گرفتار ہیں کچھ لوگ بگڑے ہوئے آمادۂ پیکار ہیں کچھ لوگ

کوفے سے نکل جانے پہ تیار ہیں کچھ لوگ کچھ قتل ہوئے ہیں، بہ سرِ دار ہیں کچھ لوگ

یا ویران ہیں سو گھر تو کہیں ایک ہے آباد

یہ تمام وہ عصری قوتیں ہیں جن سے انیسؔ نے اپنے مرثیوں کو آفاقیت بخشی ہے۔ یہ وہ قوتیں ہیں جن کی نفی کر کے کوئی ادیب عوام کے جذبات تک نہیں پہنچ سکتا۔ جب تک کوئی تخلیق عوام کے جذبات کو نہیں چھوتی یا ان کے احساسات کی ترجمان نہیں بنتی، عظیم نہیں بن سکتی۔ انیسؔ کی عظمت یہی ہے کہ انھوں نے سماج کے ہر گوشہ کو، ہر پہلو کو حلقۂ فکر میں باندھا ہے۔ انیسؔ کی مرثیوں کا تہذیبی اور ثقافتی معیار جو آج انقلاب زمانہ کا شکار ہو کر معدوم ہو چکا ہے، انہیں مرثیوں کے ذریعہ گم شدہ اقدار کی مکمل تاریخ بن کر زندہ ہے۔ بقول وحید اختر ''انیسؔ نے کربلا کے کرداروں کو اپنے زمانے کی تہذیب کی آنکھ سے اس طرح دیکھا کہ وہ کردار ہر زمانے کی آنکھ کا نور بن گئے۔''

☆☆☆

رضا امام

مراثی انیسؔ کا انگریزی ترجمہ

کسی بھی زبان سے دوسری زبان میں ادبی ترجمہ کرنا انتہائی دشوار کام ہے۔ صرف الفاظ کے بدلے الفاظ اور ساخت کے بدلے ساخت رکھ دینا اس کے لیے کافی نہیں۔ ہر زبان کی معنی خیز اصوات، الفاظ اور ساخت اس کے اپنے سماجی اور ثقافتی ماحول اور تاریخی عوامل کی دین ہوتے ہیں۔ اور چونکہ الفاظ اور معنی کے رشتے ہر زبان میں من مانے طریقے سے روایتی طور پر متعین ہوتے ہیں اس لیے کسی بھی دو زبانوں کے الفاظ کے معنی اور ان کے تاثر میں مکمل مماثلت ممکن نہیں۔ مثلاً اردو میں فارسی سے آئی ہوئی ترکیب ''سرخرو'' کا مطلب ہے کامیابی اور نیک نامی لیکن انگریزی میں "Red face" کا مطلب ہے ندامت اور شرمساری۔

یہ دشواری اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب مسئلہ انیسؔ جیسے شاعر کے ترجمے کا ہو۔ انیسؔ کی شاعری میں مذہبی جذبات، تاریخی واقعات کے ساتھ ان کے اپنے ماحول کی روایات، الفاظ کے معنی اور ان کے نفسیاتی اور صوتی تاثرات، استعارے اور تشبیہات، رعایت لفظی اور فصاحت کچھ اس طرح ایک دوسرے میں پیوست ہیں کہ کسی دوری زبان میں اس کی چاشنی اور حسن کو منتقل کرنا اگر ناممکن نہیں تو بے حد دشوار ضرور ہے۔ ایسے ترجمے کے لیے صرف اردو اور ترجمہ کی زبان پر ہی مترجم کی قدرت کافی نہیں ہے بلکہ اس میں تخلیقی صلاحیتوں کا ہونا بھی لازمی ہے۔

ترجمہ ئیں دشواری اردو مرثیہ کی اس ہیئت کی بنا پر اور بڑھ جاتی ہے، جو لکھنؤ میں پروان چڑھی اور انیسؔ اور دبیرؔ کے ہاتھوں اپنی معراج تک پہنچی۔ مرثیہ کا یہ طرز اپنی مثال آپ ہے۔ نہ تو یہ ان زبانوں میں پایا جاتا ہے جن سے اردو نے اپنے الفاظ، تراکیب اور اصناف سخن کو مستعار لیا ہے اور نہ ہی اس دور سے پہلے خود اردو میں۔ ایک تو مرثیہ کے لیے

مسدس کے استعمال سے زبان پر ایک خاص طرح کا نظم وضبط عائد ہو جاتا ہے، دوسرے اس کے مختلف، حصوں میں روایتی طور پر زبان اور بیان کے مختلف طریقے اپنائے جاتے ہیں جوان لوگوں کو جو اس روایت سے واقف نہیں عجیب لگ سکتے ہیں۔ تعارف اور چہرے میں بہت کچھ عناصر مثنوی اور قصیدے سے لیے گئے ہیں۔ اس میں حسن بیان پر زور ہوتا ہے اور اس بنا پر مبالغہ اور رنگ آمیزی اس کا ایک اہم جز ہوتے ہیں۔ اس کے اور شہادت کے بیان کے درمیان کا حصہ اردو میں رزمیہ نگاری کی واحد مثال ہے اور اس میں ہیرو کی بلند و بالا شخصیت کا ذکر، اس کی روانگی، اس کے ہتھیاروں اور گھوڑے کا بیان اور اس کی جنگ کا تذکرہ دوسری زبانوں کے رزمیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتا، اس لیے دیگر زبانوں کے قاری بھی اس سے رابطہ محسوس کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ مماثلت یہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔

مرثیہ کا بنیادی مقصد سوگ کے اظہار کے ساتھ ساتھ کربلا کے انسانی المیہ کے پہلو کو ابھارنا اور نیکی اور بدی کی جنگ میں امام حسین کی اخلاقی اور روحانی برتری کو اجاگر کرنا ہے۔ اس لیے دیگر زبانوں کے رزمیوں کی طرح اس میں فریقین کو برابر کا مد مقابل نہیں دکھایا جا سکتا۔ انگریزی میں ''گمشدگی بہشت''(Paradise Lost) اور ''بازیافتِ بہشت''(Paradise Regained) مکمل اور اعلیٰ رزمیہ کی واحد مثال مانے جاتے ہیں۔ دونوں ایک ہی واقعہ کے دو حصے ہیں۔ لیکن ان میں اول الذکر کو آخر الذکر پر اس لیے فوقیت حاصل ہے کہ ملٹن نے، اپنے مذہبی جذبات کے باوجود، رزمیہ کے تزک و احتشام کا خیال رکھتے ہوئے شیطان کے کردار کو اس طرح ابھارا ہے کہ وہ خدا سے مقابلہ کا واجب دعویدار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مرثیہ میں یہ ممکن نہیں۔ امام حسین اور ان کے رفقاء کی برتری اور یزید اور اس کی فوج کی کمتری مرثیہ اور مسلمانوں، خصوصاً شیعہ مسلمانوں کے لیے ایک مسلّمہ ہے۔ دوسری زبانوں کے قاریوں کو یہ سیاہ وسفید کی تقسیم حقیقت نگاری سے دور لگ سکتی ہے۔

میرے زیر نظر انگریزی میں انیس کے دو مرثیوں کے ترجمے ان مسائل سے نبرد آزما نظر آتے ہیں۔ ایک ترجمہ ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' کا ہے جسے ڈیوڈ میتھیوز نے The Batlle of Karbala کے نام سے انگریزی میں منتقل کیا ہے، دوسرا

ترجمہ ''یا رب چمن نظم کو گلزار ارم کر'' کا ہے جو سید غلام عباس نے اپنی کتاب The Immortal Poetry of Mir Anis میں شامل کیا ہے۔

ڈیوڈ میتھیوز کی کتاب ۹۰ صفحوں پر مشتمل ہے، جس میں ۳۳ صفحے تعارف کے ہیں اور ۵۴ صفحے مرثیہ کے لیے وقف ہیں۔ تعارف میں میتھیوز نے غیر اردو داں اور غیر مسلم قاریوں کو مد نظر رکھتے ہوئے مرثیہ کی خصوصیات، اس کی روایت، اس کی زبان اور موضوع کا ایک مختصر لیکن جامع ذکر کیا ہے جس سے قاری کو انیسؔ کے مرثیوں کی خوبیوں کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ موضوع کے سلسلہ میں نہ صرف انھوں نے کربلا کی جنگ کے واقعات اور وجوہات کا ذکر کیا ہے بلکہ اس کا تاریخی پس منظر بھی بیان کیا ہے۔ مترجم کا اپنا نقطۂ نظر تو امیر علی کی کتاب The Spirit of Islam میں پیش کیے گئے نقطۂ نظر سے مطابقت رکھتا ہے لیکن انھوں نے شیعہ نقطۂ نظر کو بھی، جس کے مطابق مرثیہ کے موضوع کو برتا جاتا ہے، واضح کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مرثیہ میں جن اشخاص کا ذکر آتا ہے ان کا تعارف بھی پیش کیا ہے اور امام حسین اور ان سے متعلق شخصیات کے لیے استعمال ہونے والے القابات کی بھی وضاحت کی ہے۔ نوٹس میں مجملاً صرف مرثیہ کو سمجھنے تک ضروری ایسے الفاظ اور کتابوں کی وضاحت کی گئی ہے جن سے غیر اردو قاری ناواقف ہو سکتے ہیں۔

جہاں تک ترجمہ کا سوال ہے میتھیوز نے اس دشوار کام کو بڑی حد تک خوبی سے نبھایا ہے۔ انھوں نے اردو مرثیہ کی ہیئت اور میر انیسؔ کے انداز بیان اور انگریزی کے مزاج اور لب و لہجہ کے درمیان تخلیقی تصرف کر کے انیس کے مرثیہ کا اس طرح ترجمہ کیا ہے کہ وہ معنی اور مطالب سے قریب رہتے ہوئے بھی انگریزی میں اپنی روانی اور سلاست قائم رکھ سکے۔ اس کے لیے ایک تو انھوں نے بنیادی طور پر انگریزی کے مقبول میٹر (بحر) آئمبک پینٹا میٹر (Iambic Pentameter) کا استعمال کیا ہے اور دوسرے قافیہ (Rhyme) کو برقرار رکھتے ہوئے دو قافیوں اور ردیفوں کی جگہ، جو مسدس کی خصوصیت ہے، تین قافیوں کا استعمال کیا ہے۔ اس سے ایک طرف تو چھ مصرعوں کے بند کا تناسب قائم رہا اور دوسری جانب زبان میں ایک قدرتی روانی کا احساس ہوتا ہے کیونکہ Iambic Pentameter کی لے جس میں بے زور رکن تہجی (Unstressed

(syllable کے بعد پر زور رکن تہجی (Stressed syllable) آتا ہے
انگریزی کی فطری لَے ہے۔ قافیوں کے استعمال میں ایک تبدیلی اور کی گئی ہے۔ بجائے
قافیہ بند شعر کے پہلے مصرع کا قافیہ تیسرے مصرع سے ملتا ہے اور دوسرے مصرع کا چوتھے
سے آخری دونوں کا قافیہ ایک ہی ہے۔ قافیہ سے اس ہلکی سی آزادی کی بنا پر ترجمہ کے
مضمون کو اصل سے زیادہ سے زیادہ قریب کرنے میں آسانی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کی مثال
مرثیہ کے مطلع ہی میں مل جاتی ہے۔ انیس نے کہا ہے:

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے
جلوہ کیا سحر کے رخِ بے حجاب نے

میتھیوز کا ترجمہ ہے:

The sun had run his journey o'er the night;
Unveiled, the Dawn revealed her glorious face.

دوسرے بند کی بیت میں امام حسین فرماتے ہیں:

ہم وہ ہیں غم کریں گے ملک جن کے واسطے
راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں اس دن کے واسطے

اس کا ترجمہ ہے:

'We are those for whom the angels weep;
To live this day we sacrificed our sleep.

پورے ترجمہ میں کم از کم ۷۵ بند ایسے ہیں جو کسی بھی انگریزی داں کو انیس کے
مرثیہ کی خوبیوں کا اندازہ کرا سکتے ہیں۔ ان میں مرقع نگاری بھی ہے، الفاظ کی صوتی
خوبصورتی بھی ہے، کردار نگاری بھی ہے، کرداروں کا انداز بیان بھی، استعاروں اور
تشبیہات کی خوبصورتی بھی، جاہ و حشم بھی اور غم و افسردگی کا عنصر بھی۔ مرثیہ کے مختلف
حصوں کے چند نمونوں سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے

بارہویں بند میں منظر نگاری کرتے ہوئے انیس نے کہا ہے:

ٹھنڈی ہوا میں سبزۂ صحرا کی وہ لہک   شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریٔ فلک

وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک　　ہر برگ گل پہ قطرہ شبنم کی وہ جھلک

ہیرے خجل تھے گوہرِ یکتا نثار تھے

پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

That dancing brilliance wafted by the breeze!

the russet satin sky was put to shame.

Rosy dew-drops hung on swaying trees;

Diamonds were abashed and pearls found blame.

Each bush was crowned by glittering diadems;

The leavesof every tree wore precious games.

بند ۲۹ میں امام حسین اور ان کے ساتھیوں کی نماز کا ذکر ہے:

خم گردنیں تھی سب کی خضوع اور خشوع میں

سجدوں میں چاند تھے مہ نو تھے رکوع میں

ترجمہ ہے:

Their necks were bowed in humble adulation;

Like the crescent moon they folded in prostration.

بند ۵۶ سے ۷۱ تک حضرت زینب اور ان کے صاحبزادوں عون و محمد کی گفتگو ہے جو ماں کی سفارش سے علم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ترجمہ میں کردار کی مناسبت سے بڑی چابکدستی سے اس گفتگو کو قلمبند کیا گیا ہے۔ عون و محمد دعویٰ کرتے ہیں:

طاقت میں کچھ کمی نہیں گو بھوکے پیاسے ہیں

پوتے انہیں کے ہم ہیں انھیں کے نواسے ہیں

میتھیوز نے اسے اس طرح پیش کیا ہے:

We may be thirsty, but we fight like lions.

Of Ali and of Ja'far we are scions.

زینب کا خالص نسوانی اور مادرانہ ہندوستانی لہجہ اس مصرعہ سے بند ۶۸ کے آخر میں

بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔

Why do you plunge this dagger in my heart?

گھوڑے، علم اور تلوار کے ذکر میں میر انیسؔ کے قلم کی جولانی کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ترجمہ میں اس کے نمونے کچھ ذیل میں پیش ہیں۔ بند ۸۹ میں گھوڑے کا ذکر ہے:

Behold the way his eyes flash, stern and bold!

How proudly struts and sways the noble horse!

His limbs were fasioned in a perfect mould.

He stops and pricks his ears up in his course.

بند ۹۱ میں علم کے بیان کا اندازہ اس بیت سے لگایا جا سکتا ہے:

The emblem and the sun shone in both ways,

Entangling in the air their brilliant rays.

بند ۱۳۱ میں تلوار کا ذکر ہے:

The flaming sword was wrenched out of its cover,

As moonbeams fly, as perfume leaves the rose.

As a comely maiden taken from her lover,

As breath departs the breast, as red blood flows.

اس مرثیہ میں میر انیسؔ کے، گرمی کی شدت سے متعلق چند مشہور بند ہیں۔ میتھیوز نے اتنا مناسب ترجمہ ان جواہر پاروں کا کیا ہے کہ کوئی بھی اردوداں آسانی سے انھیں پہچان سکتا ہے:

The days of heat defy description.

My tongue burns like a candle if I try.

(بند ۱۱۴)

The Alqama dred up: its banks were bare:

Its bubbles burst and from the heat took flight.

(بند ۱۱۵)

The red flew from the rose, green from the glade;

In wells the water dropped in search of shade.

(بند ۱۱۶)

The whirlpool on the water spun with flame;

From burning bubbles sparks of fire would leap;

The tongues of waves were dry; no solace came

To crocodiles which languished in the deep.

The rivers blazed asif on judgements Day,

And roasted fish upon their billows lay.

(بند ۱۲۰)

امام حسین کی جنگ اور ان کی تلوار بازی سے متعلق بندوں کا ترجمہ بھی اس طور پر کیا گیا ہے کہ اصل کی جھلک اس میں بخوبی نظر آتی ہے:

Husain swooped like an eagle from on high,

As lions in the jungle pounce on deer.

(بند ۱۳۲)

The sparks flew from the sword that cut and thrust.

Heads were severed in the wind that blew.

(بند ۱۳۳)

The foe on whom the swords fell split in two:

The blade came down again to make him four.

The path it took was the one Death pointed to:

However hard its task, it craved for more.

No rider in his saddle could be found:

The armour's chains lay scattered on the grounnd. (بند ۱۳۴)

امام حسین کی شہادت، ان کی بے کسی اور اس کے سوز و گداز کو کس طرح میتھیوز نے ترجمہ میں ڈھالا ہے اس کا نمونہ یہ دو بند ہیں:

From all directions arrows poured like rain;
Assassins rushed with spears and daggers bared,
Such pain befell Husain. Such pain! Such pain!
The one who on the prophet's lap was reared.
No one to pluck the arrows from his chest.
No one to lift him to his place of rest.

(بند ۱۸۲)

Husain falls from his mount—— calamity!
His holy foot falls from the horse's girth.
His side is gaping open—— misery!
He swoons; his turban drops upon the earth.
The Quran has fallen headlong from its stand.
The Ka'aba's walls have crumbled into sand.

(بند ۱۸۳)

مندرجہ بالا مثالیں میتھیوز کے ترجمہ کی خوبیوں کا اظہار ضرور کرتی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مترجم کو ترجمہ کی دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہے۔ کئی مقامات ایسے بھی ہیں جہاں قافیہ کی یا بحر (Meter) کی مجبوریوں یا مناسب مترادف تراکیب کی کمی کی بنا پر نہ صرف مصرع اصل سے دور ہو گیا ہے بلکہ اس کا مطلب بھی بدل گیا ہے۔ مشہور بیت ہے۔

خواہاں تھے زہر گلشنِ زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

میتھیوز نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

The primroses of Zohra's garden drank

The dew, collected on the rosy bank.

نہ صرف یہ ترجمہ اصل مفہوم سے دور ہے بلکہ اس میں وہ تناؤ بھی ختم ہوگیا ہے جس کا اظہار امام حسین اور ان کے رفقاء کی پیاس اور اسے بجھانے کی فطرت کے بے جان مظاہر کی کوشش کے ذریعہ کیا گیا ہے۔

اسی طرح میتھیوز کے بند ۵ اور میرے زیر نظر اردو مرثیہ کے بند ۶ کا مصرعہ ہے:
'عالی منش' سبا میں سلیماں، وفا میں شیر' ترجمہ میں یہ مصرع بے معنی ہوگیا ہے:

In battle Solomon, in Sheba lions;

بند ۱۰۴ کے بیت کے آخری مصرع میں امام حسین کے رفقاء کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے انیس نے کہا ہے۔

ہنگامِ ظہر خاتمۂ فوج ہوگیا

میتھیوز نے fight سے قافیہ ملاتے ہوئے اس کا ترجمہ کیا ہے:

By afternoon the army was in flight

ظاہر ہے کہ اس کا اطلاق امام حسین کی ختم شدہ فوج پر نہیں ہوسکتا۔

بند ۱۴۳ میں میتھیوز نے 'زہرہ تھا آب' کا ترجمہ 'Turned to bile' کیا ہے جو نہ تو اردو کے محاورے کا لفظی ترجمہ ہے اور نہ انگریزی میں اس کے معنی خوفزدہ ہونے کے ہیں۔ انگریزی کے لحاظ سے اس کے معنی تلخ یا چڑ چڑا ہو جانا ہوں گے۔

اسی حصہ کے ایک اور بند کے مصرع: 'چھوڑے تھا گرگ، منزل و ماواء کربلا' کو میتھیوز نے الٹا کردیا ہے۔ ان کا مصرع ہے۔

To Karbala for refuge wolves had fled.

ان چند کمزوریوں کے باوجود، جو غالباً سہو کا نتیجہ ہیں، اور ترجمہ کی دشواریوں کا، جن کا میں نے شروع میں ذکر کیا ہے، اظہار کرتی ہیں The Battle of Karbala ایک خوبصورت اور عمدہ ترجمہ ہے۔

سید غلام عباس کا 'یارب چمن نظم کو گلزارِ ارم کر' کا ترجمہ ایک عالمانہ کتاب کا جز

ہے۔ پیش لفظ، دیباچہ، تعارف اور اعتراف کے ۲۶ صفحات کے علاوہ یہ کتاب ۳۶۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں سے ۱۱۳ صفحے مرثیہ اور اس کے ترجمہ کے ہیں۔ ۲۶ صفحے تصریحات کے اور ۲ صفحے فہرست کتب کے۔ باقی صفحے مرثیہ کی خصوصیات، عربی، فارسی، اردو، دکنی، سندھی، دہلوی اور لکھنوی مرثیوں، انیسؔ کی حیات، انیسؔ کی شاعرانہ ذہانت اور انیسؔ کو خراجِ عقیدت کے لیے وقف ہیں۔

یہ کتاب صحیح معنی میں معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ تصریحات میں نہ صرف یہ بتایا گیا ہے کہ مرثیہ میں بارہ اماموں کے حوالہ کی کیا اہمیت ہے، بلکہ مختصراً ہر امام کی سوانح عمری بھی دی گئی ہے۔ اسی طرح اعتراف میں نہ صرف لوگوں کا شکریہ ادا کیا گیا ہے بلکہ اسلام اور رسولِ اسلام کی عظمت سے متعلق یورپ کے کئی ڈرامہ نگاروں، مضمون نگاروں اور تاریخ دانوں کے اقوال کو بھی نقل کیا گیا ہے۔ نفس کتاب میں مختلف زبانوں کے مرثیوں کی خصوصیات سے بھی بحث کی گئی ہے اور ان کے نمونے معہ ترجمہ کے پیش کیے گئے ہیں۔ انیسؔ کی شاعری کی خصوصیات بہت واضح طور پر بیان کی گئی ہیں اور ان کی سند میں، ضرورت کے لحاظ سے ناقدوں کے قول بھی پیش کیے گئے ہیں۔ انیسؔ کے حالاتِ زندگی میں نہ صرف ان کے بزرگوں کا ذکر شامل ہے بلکہ بعد کی نسلوں کا بھی، مع شجرہ کے۔ انیسؔ پر کام کرنے والے کسی بھی طالب علم یا مضمون نگار کے لیے یہ کتاب کافی مفید ثابت ہوسکتی ہے، لیکن اس علمیت کے سیاق وسباق میں ایک بات بڑی عجیب لگتی ہے۔ عربی مرثیہ والے باب میں صفحہ ۵ پر مصنف نے کہا ہے کہ حضرت حمزہؓ کی بدر میں شہادت ہوئی تھی اور چند سطروں کے بعد پھر کہا ہے کہ ہندہ نے ان کا کلیجہ اس لیے چبایا تھا کیونکہ انھوں نے احد میں اس کے عزیزوں کو شکست دی تھی۔ (نہ جانے یہ غلطی تاریخ کے بیان سے تعلق رکھتی ہے یا پروف ریڈنگ سے؟)

جہاں تک مرثیہ کے ترجمہ کا سوال ہے اس سے کسی ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے میں، خصوصاً جب کہ دوسری زبان مترجم کے لیے غیر ملکی ہو، کیا کیا دشواریاں پیش آسکتی ہیں اس کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ مرثیہ کا پہلا بند ہے۔

یا رب چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر   اے ابرِ کرم خشک زراعت پہ کرم کر

تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر   گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیمِ سخن میرے قلم رو سے نہ جائے

غلام عباس نے اس کا ترجمہ اس طور پر کیا ہے:

O God! make my bouquet of poetry bloom into a
heavenly bower,
Thou art all rain, and I am a parched crop, soak me with
water,
Thou art all grace, shower me with the grace for a while,
O God! I am all mute, give me a tongue, fluent and agile,
So long as the sun retains its luminous lustre,
My pen be blassed with a serene and sublime grandeur

اس بند سے ایک تو غلام عباس کی قافیہ پیمائی (rhyme scheme) کا پتہ چلتا ہے اور دوسرے ان کے بھاری بھرکم لاطینی زدہ الفاظ کے استعمال کے شوق کا۔ پہلی کوشش کے لیے ان کی ہمت کی داد دینا پڑے گی کیونکہ تین بیتوں (couplets) کا استعمال مضمون کو کافی حد تک مقید کر دیتا ہے، جس سے مناسب ترجمہ مشکل ہو جاتا ہے۔ دوسری خصوصیت شاید دبیر کے بلیغ کلام کے لیے موزوں ہو لیکن انیس کے فصیح اور سلیس کلام کے لیے اینگلو سیکسن (Anglo-saxon) مآخذ کے الفاظ زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن مترجم کو غالباً ان دونوں چیزوں کے استعمال میں کوئی دقت اس لیے نہیں معلوم ہوئی کیونکہ انھوں نے بحر (Meter) کا استعمال بہت آزادانہ طور پر کیا ہے۔ تمام کوششوں کے باوجود میں بحر (Meter) کو نہیں پا سکا۔ کسی مصرع میں پرزور رکن تہجی (Stressed syllables) آٹھ ہیں تو کسی میں سات، کسی میں چھ اور کسی میں پانچ۔ اس طرح بے زور رکن تہجی کی تعداد بھی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہر دو قسم کے رکن تہجی کی مجموعی تعداد میں بھی کوئی توازن نہیں --- آواز کی گھن گرج کے شوق میں مترجم نے متروک الفاظ کا بھی استعمال

کیا اور وہ بھی غلط۔ مثلاً ترجمہ کے بند ۳۵ میں 'میں اس سے ہوں اور مجھ سے ہے یہ' کا ترجمہ غالباً انجیل کے زیر اثر یوں کیا گیا ہے 'I am unto him, he is unto me'۔

unto ایک متروک لفظ ہے جس کا مطلب 'کو' یا' تک' ہوتا ہے نہ کہ 'سے'۔

میں کوئی کلیہ تو نہیں بنانا چاہتا لیکن دونوں ترجموں کا موازنہ کرنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اچھا ترجمہ تب ہی ہوسکتا ہے جب مترجم جس زبان میں ترجمہ کیا جارہا ہے اس کے ماحول میں پلا بڑھا ہو جبکہ جس زبان سے ترجمہ کیا جارہا ہے اس کا عالمانہ اکتساب کافی ہے۔ اگر اس کا الٹا ہو تو کافی مشکلیں کھڑی ہوسکتی ہیں۔



☆ میر انیسؔ نے، کہ باوجود خداداد مناسبت کے، چار پُشت سے شاعری اور مرثیہ گوئی اُن کے خاندان میں چلی آتی تھی، اُس پر اُردو زبان کے مالک تھے اور لکھنؤ بنا ہوا تھا، اس طرز کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا اور اُردو شاعری میں جو کہ ماءِ راکد کی طرح مدّت سے بے حس و حرکت پڑی تھی، تموّج بلکہ تلاطم پیدا کردیا۔ اگرچہ سوسائٹی کے دباؤ اور کم عیار حریفوں کے مقابلے نے، میر انیسؔ کو ہر جگہ جادۂ استقامت پر قائم رہنے نہیں دیا، بلکہ اُس ڈھر پتے کی طرح، جسے مجلس کے بے مغزوں کو رجھانے کے لیے کبھی کبھی بارہ ماسا اور چو بولے بھی الاپنے پڑتے ہیں، اکثر مبالغہ و اغلاق کی آندھیوں کے طوفان اُٹھانے پڑے۔ مگر اِس قسم کی بے اعتدالیاں، اُن فوائد کے مقابلے میں جو اُن کی شاعری سے اردو زبان کو پہنچے، نہایت بے حقیقت اور کم وزن ہیں۔ اُنھوں نے بیان کرنے کے نئے نئے اسلوب اردو شاعری میں کثرت سے پیدا کردیے۔ ایک ایک واقعے کو سَو سَو طرح سے بیان کرکے، قوّتِ متخیّلہ کی جولانیوں کے لیے ایک نیا میدان صاف کردیا۔ اور زبان کا ایک معتد بہ حِصّہ، جس کو ہمارے شاعروں کی قلم نے مَس تک نہیں کیا تھا اور جو محض اہلِ زبان کی بول چال میں محدود تھا، اُس کو شعرا سے روشناس کرادیا۔

شمس العلما، الطاف حسین حالیؔ، مقدمہ شعر و شاعری، ص ۱۹۱، نسخۂ جامعہ

علامہ عقیل الغروی

میر انیسؒ اور علامہ جمیل مظہری

اردو شاعری کے اساتذۂ متاخرین میں علاّمہ جمیل مظہری کو فکری اور فنی دونوں اعتبار سے امتیاز وعظمت حاصل ہے۔ وہ اپنے فلسفیانہ طرزِ تفکّر، نفسیاتی غور وتاُمّل، تخلیقی تنوع اور فن کارانہ تلوُّن سبھی حوالوں سے اپنی شخصیت اور اپنی آواز کا لوہا منوا چکے ہیں۔ اُن پر اگر چہ نسبتہً کم لکھا گیا ہے تاہم جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اُس میں مستند ترین اصحابِ قول وقلم نے اُن کی اِن تمام حیثیتوں کا بر ملا اعتراف کیا ہے۔ ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت فن کار کی حیثیت سے جمیل مظہری نے کسی بھی صنفِ سخن کو اپنے حُسنِ التفات سے محروم نہیں رکھا۔ غزل، نظم، رباعی، قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی جیسی مستقل اور اہم اصناف کے علاوہ مواد، موضوع، مضمون اور ہیئت ہر لحاظ سے اور بھی بہت سے ''فن پارے'' اُن کے رشحاتِ فکر وقلم سے گنجینۂ شعر وادب کی زینت بنے۔ نثر کے میدان میں بھی روزناموں کے صحافتی اور فکاہیہ مضامین سے لے کر انشائیوں، افسانوں، تنقیدی مقالات، تاثراتی رشحات اور کتابوں کے مقدموں، دیباچوں اور تبصروں تک اُن کے آراء وافکار گرانقدر ادبی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ دیکھنا کہ انہوں نے میر انیس کے بارے میں کیا اظہارِ نظر فرمایا ہے اور خود اپنے تخلیقی سفر میں بطورِ خاص ایک نظم نگار اور ایک مرثیہ گو کی حیثیت سے، انیس سے کس قدر کسبِ فیض کیا ہے ارباب ذوق کے لیے لطف ولذت سے خالی نہ ہوگا۔

جمیل مظہری نے میر انیس کو تخلیقی سطح پر بھی خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور باقاعدہ تنقیدی مضامین کی شکل میں بھی اُن کے فکر وفن کو سراہا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے میں انیس کے بعض اشعار پر اُن کی تضمینوں کا ذکر کروں گا۔ انہوں نے انیس کے مختلف سلاموں میں سے ایک ایک شعر کا انتخاب کر کے اُن پر نہایت فکر انگیز تضمینیں کی تھیں۔ اُن کے دیکھنے سے اس بات کا سراغ ملتا ہے کہ وہ انیس کے اشعار میں کس طرح کے مضمون ومعنی کا اکتشاف کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ انیس کی بارگاہ میں اُن کا خراجِ تحسین بھی انیس ہی کی زمین میں سننے کو مل جاتا ہے۔

انیس کا ایک شعر ہے: ''در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے

سر جہاں رکھتے ہیں سب ہم واں قدم رکھتے نہیں''

اَب اس پر تضمین ملاحظہ فرمایئے:

مال وزر رکھتے نہیں جاہ وحشم رکھتے نہیں

کوئی دولت ہاتھ میں ہم جز قلم رکھتے نہیں

ہم ہیں شاعر سربسر اخلاص سرتاپا نیاز

دل میں رکھتے ہیں لچک، گردن میں خم رکھتے نہیں

''در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے

سر جہاں رکھتے ہیں سب ہم واں قدم رکھتے نہیں''

انیسؔ کا ایک اور شعر جس پر جمیل مظہری نے تضمین کی ہے مندرجہ ذیل ہے:

''نمود و بود بشر کیا محیطِ ہستی میں

ہوا کا جب کوئی جھونکا چلا حباب نہ تھا''

اَب تضمین دیکھیے:

بجا کہ تو ہے بہر حال بامُرادِ دوست

بجا کہ میں بہر انداز کامیاب نہ تھا

مگر سوال یہ ہے جبکہ کُھل گئیں آنکھیں

تو کیا نتیجۂ ذوقِ طاب سراب نہ تھا

یہ اَب کُھلا کہ چکاچوندھ جس سے تھیں آنکھیں

وہ اِک حقیر سا ذرہ تھا آفتاب نہ تھا

شعور جب ہُوا بالغ تو تشنگی نے کہا

کہ جس کو آب سمجھتے تھے ہم وہ آب نہ تھا

میں پوچھتا ہوں کہ یہ اقتدارِ بے بنیاد

اِک اعتبار تھا، کیا اِک لطیف خواب نہ تھا

ہمیشہ پیشِ نظر رکھ انیسؔ کا یہ شعر

وہی انیسؔ کہ جس کا کوئی جواب نہ تھا

''نمود و بود بشر کیا محیطِ ہستی میں

ہوا کا جب کوئی جھونکا چلا حباب نہ تھا''

ادبی بصیرت اِن تضمینوں میں میر انیسؔ کی زبان، اُن کے مخصوص لہجے اور اُن کی شعریات سے جمیلؔ مظہری تک، زبان، لہجے اور شعریات کا سفر اور دونوں کے مابین ربط و تعلق اور اختلاف و امتیاز بھی درک و دریافت کر سکتی ہے۔ اِس کے علاوہ جمیلؔ نے (دوسری تضمین میں) جس ''دوست'' کو مخاطب کیا ہے اُس کا تصوراتی یا قیاسی تعین کرنے اور انیسؔ کے شعر نیز اُس پر اضافہ کیے گئے اشعار سے دُنیا کی بے ثباتی کا اخلاقی درس یا اصلاً دُنیا و مافیہا کے معدومِ محض ہونے کا صوفیانہ تصور اخذ کرنے سے پہلے اس مشہور مکالمے کو ذہن میں رکھ لینا بھی کار آمد ہوگا جو ایک دہریہ اور ایک امامِ معصوم کے درمیان اصحابِ نقل و روایت بہ کمال وثوق روایت کرتے آئے ہیں۔ جس میں امام نے دہریہ کے اِنکارِ آخرت یا انکارِ دارِ بقا کے جواب میں فرمایا ہے کہ: ''فرض کرو یہی دُنیا سب کچھ ہے، اِس کے بعد کچھ بھی نہیں، تم دُنیا کی لذتوں کو حاصل کر رہے ہو، آخرت کے لیے کچھ بھی نہیں کر رہے ہو، مَیں دُنیا کے بہت سے لذائذ سے محروم ہوں، بہت سے کام آخرت کی خاطر انجام دے رہا ہوں، اَب اگر مرنے کے بعد واقعتاً ''دارِ بقا'' نہیں ہے تو یقیناً تمہارا کوئی نقصان نہیں، لیکن اگر ہے تو پھر خسارہ کس کا ہوگا؟'' خیر اس ادبی مطالعہ میں یہ حوالہ (جو میں نے دانستہ طور پر دیا ہے) ہوسکتا ہے کہ بعض حضرات پر قدرے گراں گزرے لیکن اس کے لیے معذرت بھی کیا کر سکتا ہوں!

اَب انیسؔ کے اِس شعر پر کہ ؎

نظم ہے یا ہیں دُرِ شہوار کی لڑیاں انیسؔ
جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں!

جمیلؔ مظہری کی وہ تضمین ملاحظہ فرمایئے جس میں انہوں نے انیسؔ اور اُن کے فن پر بھرپور اظہارِ خیال فرمایا ہے:

گرچہ دعوت دے رہا ہے بحرِ ذخّار انیسؔ
اپنی غوّاصی کا بیڑا میں ڈبو سکتا نہیں

اُس کی موجیں یم بہ یم اور اُس کی وسعت بیکراں
اس سمندر کو قلم میرا بلو سکتا نہیں

گرمیِ گفتار کو، حرکات کو، رفتار کو،
اے مصوّر تو لکیروں میں سمو سکتا نہیں

یہ تو ہے اِک ساحرِ شامِ اودھ کا معجزہ
مانی و بہزاد سے یہ کام ہو سکتا نہیں

ڈھل گئی اردو مثالِ چادرِ حورانِ خُلد

کون کہتا ہے زباں کو کوئی دھو سکتا نہیں

مَعدنِ فن میں ہیں اَب لعل و گہر کے اتنے ڈھیر

دامنِ تنقید جن کا بوجھ ڈھو سکتا نہیں

مرثیہ اِک آنسوؤں کا کھیت ہے اِس کھیت میں

اِس طرح موتی کوئی فن کار بو سکتا نہیں

مرحبا عقدہ کشائے گیسوے لیلائے فن

شانگی سے کیا تری آئینہ کو سکتا نہیں

''نظم ہے یا ہیں دُرِ شہوار کی لڑیاں انیسؔ

جوہری بھی اِس طرح موتی پرو سکتا نہیں

اِن تضمینی اشعار میں جمیل مظہری کا تخلیقی ذہن اور تنقیدی شعور، میر انیسؔ کے متعدد فنکارانہ امتیازات کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتا ہے۔ سب سے پہلی چیز انیسؔ کے تخلیقات کی وسعت (بحرِ ذخّارِ انیسؔ) ہے۔ ظاہر ہے کہ جمیلؔ یہ بات صرف مراثی کی تعداد کے لحاظ سے نہیں کہہ سکتے بلکہ اُن کی نظر میں انیسؔ کے شعری مضامین کا تنوع اور ایک ایک مضمون پر اُن کے گونا گوں شاعرانہ تصرفات ہی ہوں گے۔ جس نے اردو شاعری کی دُنیا میں ایک بالکل نئی اور مستقل وسعت بداماں تخلیقی فضا پیدا کی اور جس نے انیسؔ کے بعد آنے والے ہر اچھے اور بچے شاعر کو کسی نہ کسی طور پر متاثر کیا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ انیسؔ کی پیدا کردہ تخلیقی فضا کی یہ وسعت یک بُعدی نہیں ہے۔ یہ ''یم بہ یم'' ''بیکراں'' ''بحرِ ذخّار'' کم از کم چہار بُعدی ہے۔ ایک بُعد زبان کا ہے۔ جسے اِس تخلیقی فضا کا اُفقی یا عَرضی بُعد بھی کہہ سکتے ہیں۔ انیسؔ کا عہد ''اصلاحِ زبان'' کے لیے مشہور ہے۔ ناسخؔ اور اُن سے بڑھ کر اُن کے تلامذہ نے اِصلاحِ زبان کی جو باقاعدہ تحریک چلا رکھی تھی وہ کچھ اُنہیں کے سلسلے تک محدود اور منحصر نہیں رہ گئی تھی بلکہ بقولِ مولوی غلام ربانی۔ ''اُس وقت استادی منوانے کے لیے ضرور تھا کہ زبان میں کوئی اصلاح کرے اور کچھ لفظ ترک کرے۔ استاد اپنے شاگرد کو حکم دیتا تھا کہ ہم نے فلاں لفظ ترک کر دیا ہے تم بھی اسے شعر میں مَت باندھو۔'' غلام ربانی مرحوم مزید لکھتے ہیں: ''اِس کی لپیٹ میں (بعض) ایسے لفظ بھی آ گئے جن کا بدل آج تک پیدا نہیں ہُوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا کسی شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ لفظوں کو ترک کرا دے۔'' لفظ بے جان نہیں ہوتے۔ یہ جان داروں کی طرح پیدا ہوتے ہیں، بڑھتے ہیں اور

مر جاتے ہیں۔ لیکن جیتے جاگتے لفظوں کا گلا گھونٹنا کہاں تک درست ہے .... میر انیسؔ کا دامن اس لفظ کشی سے پاک ہے۔ انھوں نے نہوڑانا، ڈگ ڈگانا، جھنڈ والے بال، اُوجھڑ، دڑیڑا، ڈانڈ جیسے لفظوں کو (بھی) شاعری کے دربار میں پہنچا دیا اور زبان کو فائدہ پہنچایا۔'' (الفاظ کا مزاج، ص ۱۱۴۔۱۵)

یہ مسئلہ کہ میر انیسؔ نے بھی کچھ متروکات تجویز کیے تھے یا نہیں، بعض دوسرے بیانات کے پیشِ نظر قدرے بحث طلب ضرور ہے لیکن یہ تو بہر حال سامنے کی بات ہے کہ زبان کی تراش خراش کے سلسلے میں جن اساتذہ کا نام بار بار لیا جاتا ہے اُن میں انیسؔ شامل نہیں۔ گویا انیسؔ نے بہت سے الفاظ کو ترک کرنے کے بجائے محض اپنے شاعرانہ اور فن کارانہ تصرف سے انہیں شاعری کی زبان میں مناسب جگہ دی اور انہیں مزید حسن و متانت سے ہمکنار کیا۔ اس کے علاوہ صرف چند نہیں بلکہ سینکڑوں الفاظ کا اضافہ بھی کیا۔

انیسؔ کی تخلیقی فضا کا دوسرا بُعد (جسے اِس فضا کا عمودی بُعد بھی کہہ سکتے ہیں) مضمون آفرینی ہے۔ جو بجائے خود کثیر بُعدی ہے۔ بلا شبہ انیسؔ تک اردو کے تمام شعرا نے مل کر جتنی مضمون آفرینی کی ہوگی انیسؔ نے تنِ تنہا اُس پر کم از کم اتنا ہی اضافہ کیا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ مضمون آفرینی محض کسی نئے موضوع کو نظم کر دینے کا نام نہیں ہے۔

انیسؔ کی تخلیقی فضا کا تیسرا بُعد ''ندرتِ بیان'' ہے۔ اس لیے کہ صرف ''مضمونِ تازہ'' ہی سے بات نہیں بنتی بلکہ اُس کی ''ادائیگی'' بھی ایک مستقل اور مؤثر حیثیت رکھتی ہے۔ جمیلؔ مظہری نے ''گرمیِ گفتار کو، حرکات کو، رفتار کو'' انیسؔ جیسے'' ساحرِ شامِ اَودھ کا معجزہ'' قرار دیا ہے، یہ چیزیں دراصل اسی دوسرے اور تیسرے بُعد یعنی نُو بہ نُو اور نوع بہ نوع مضامین اور ندرتِ بیان و حسنِ ادا کے ضمن میں آتی ہیں۔ اشعار میں الفاظ و اصوات کے فنکارانہ استعمال سے انیسؔ نے جو متحرک و جاندار یا ساکن و جامد عناصر کی کامیاب نقاشیاں اور مرقع نگاریاں کی ہیں اُن پر کم و بیش ہمارے سبھی ناقدین خصوصاً انیسؔ کے سخن فہموں اور فن شناسوں نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ لیکن اِس باب میں ڈاکٹر نیر مسعود اور ظ انصاری کے مقالات حقیقتہً اِستثنائی طور پر قابلِ داد اور لائقِ استفادہ ہیں۔

انیسؔ کا موضوع اور اپنے موضوع سے اُن کا ''عشق'' اُن کی مخصوص تخلیقی فضا کا وہ چوتھا بُعد تخلیق کرتا ہے جس نے اُنہیں زمان کی زوال و فنا پذیر گرفت پر لازوال تخلیقی گرفت عطا کی ہے۔ اگر چہ کربلا کا واقعہ، امامِ حسین علیہ السلام کی شخصیت اور اُن کے اصحاب و اقربا کی شہادت کا تذکرہ اردو زبان میں روزِ اوّل ہی سے نظم ہوتا آرہا تھا لیکن یہ انیسؔ کے جوہرِ قابل کا کمال تھا کہ انہوں نے اِس موضوع کے زمانی اور

لازمانی سبھی ابعاد کو اپنے فکر و فن میں اِس طرح جذب کیا جس سے صنفِ مرثیہ گوئی کو لازوال اہمیت، عظمت اور بقا نصیب ہوئی۔

میر انیسؔ نے فی الجملہ جو زبان کی خدمت کی، اُس کی سلاست، فصاحت، قوتِ ابلاغ و ترسیل میں جو بے مثال اضافہ کیا اور سب سے بڑھ کر ''مرثیہ'' جیسی صنف میں جو صرف رونے رُلانے کے مقصد کی حامل تھی، مضامین نَو کا انبار لگا کر پھر انہیں موتیوں کی طرح پرو کر اُنہیں اپنے عشق کی آنچ سے تپا کر، انہیں کوثر و سلسبیل کی مزید آب عطا کر کے جو فن پارے تخلیق کیے جمیلؔ مظہری نے دَرج بالا تضمین کے بقیہ اشعار میں انہیں تنقیدی نکات کو شعری زبان میں پیش کیا ہے۔

(۲)

شعری خراجِ تحسین کے علاوہ جمیلؔ مظہری نے متعدد مقالات میں میر انیسؔ کے بارے میں اپنے احساسات، تاثرات اور تنقیدی نظریات کا اظہار فرمایا ہے۔ اُن کے اِن مقالات کا جائزہ تو ذرا بعد کو لیا جائے گا لیکن سب سے پہلے انیسؔ اور اُن کے فن کے تعلق سے جمیلؔ کا یہ نقطۂ نظر ملاحظہ فرمائیے:۔

> ''دنیا کے عظیم واقعہ نگار شاعروں میں یونان کا ہومرؔ ایران کا فردوسیؔ انگلستان کا ملٹنؔ اور ہندوستان کے والمیکؔ اور بیاسؔ ہیں۔ ان کی قدرتِ سخنوری سے کسے انکار ہوسکتا ہے لیکن جہاں تک صرف قدرتِ سخنوری کا تعلق ہے انیسؔ........کو ان واقعہ نگاروں پر کم از کم اس حیثیت سے تو فضیلت حاصل ہے ہی کہ اُنھوں نے جس واقعہ کو بھی نظم کیا ہے صرف ایک ہی مرتبہ نظم کیا ہے۔'' (منشوراتِ جمیل، مرتبہ ڈاکٹر اعجاز علی اعجاز علی ارشد۔ ۱۹۹۱ص ۶۵)

جمیلؔ مظہری کا یہ نقطۂ نظر اُن کے بزرگ مرتبہ پیش رَو مولانا امداد امام اثرؔ کے نقطۂ نظر سے نزدیک تر نظر آتا ہے۔ اگر چہ دونوں کے یہاں تجزیہ، تحلیل اور استدلال میں بہت فرق ہے۔ امداد امام اثرؔ نے کاشف الحقائق میں لکھا ہے:

> ''رزمی شاعری میں میر انیسؔ۔ ہومرؔ، ملٹنؔ، ورجلؔ اور فردوسیؔ پر غالب ہیں۔ اور اگر ان کا کوئی جواب ہے تو بالمیکؔ ہے یا ویاسؔ ہے۔''

(امداد امام اثر: بہارستانِ سخن یا کاشف الحقائق، مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی، ج ۲ ص ۴۰۵)

انیسؔ کے بارے میں جمیلؔ مظہری کے ایک مقالے کا عنوان ہے: ''میر انیسؔ اور صنفی جذبات

کی ترجمانی"۔ جمیلؔ نے اپنے اِس مقالہ کا آغاز اِس شکوے سے کیا ہے کہ دُنیا بھر کے شاعروں نے ادب اور شاعری کا بیشتر حصہ صِرف اور صِرف مَرد کے دِل میں پیدا ہونے والے ایک خاص جنسی اور صنفی جذبہ و احساس کی ترجمانی میں صَرف کیا ہے۔ اِس کے مقابلہ میں، سنسکرت اور ہندوستانی بھاشاؤں کی غزلیہ شاعری کو چھوڑ کر، عورت کے دِل میں پیدا ہونے والے جذبہ و احساس کی ترجمانی بھی کما حقہٗ نہیں ہوئی ہے۔ اور اس سے ہٹ کر دوسرے اِنسانی ادراکات، احساسات اور جذبات کا اظہار تو بالکل ہی نہیں ہُوا۔ مقالہ کا نچوڑ یہ ہے کہ حقیقتہً ہمارے مرثیہ نگاروں نے المیہ شاعری میں رزمیہ کا پیوند لگا کر دُنیا کو شاعری کی ایک بالکل نئی صنف عطا کی ہے۔ جس میں بھائی، بہن، بیٹے، بھتیجے، آقا، غلام، صحابی اور ساتھی غرض مختلف انسانی رشتوں کے آپس کے تعلقاتِ خاطر اور جذبات و احساسات کی جو ترجمانی کی گئی ہے وہ اور بھی خاصے کی چیز ہے۔ جس کے ضمن میں صنفی جذبات کی بھی نہایت کامیاب ترجمانی پائی جاتی ہے۔

اس مقالے سے یہ مقام ملاحظہ فرمائیں:

> "انیسؔ عہدِ حاضر کے مغرب زدہ نقادوں کے معیار پر ایپک شاعر ہوں یا نہ ہوں، لیکن اِس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ انیسؔ نے اپنے مرثیوں میں رزم نگاری کے کامیاب مرقعے دکھلائے ہیں۔ انیسؔ کے مراثی اگر ایپک نہیں تو ہومر کی الیڈ مرثیہ نہیں! مرثیہ ایپک کی طرح ایک مخصوص صنفِ شاعری ہے جو ایرانی رزمیہ کے زیر اثر ہندوستانی مٹی کھا کر پروان چڑھی۔ اس کے حسن و قبح کو جانچنے کے لیے یورپ کی وہ کسوٹی کام نہیں دے سکتی جس پر یورپ کی ایپک کو پرکھا جاتا ہے۔ اِس کے پرکھنے کے لیے ہمیں ایک نئی کسوٹی کی ضرورت ہے۔"
>
> (منشورات جمیل مرتبہ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد۔ ۱۹۹۱ص ۷۳)

جمیلؔ خاص طور پر انیسؔ کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> "اِس آرٹ (اردو مرثیہ) کا کینوس ابتداً بہت ہی چھوٹا تھا۔ انیسؔ نے اسے وسعت دی۔ اِس المیہ شاعری میں انھیں چیزوں کا اضافہ کیا جو اس کے مزاج کے موافق ہوں۔ ایسے عناصر شامل نہیں کیے جو اِس کی فنی طبیعت کے لیے اجنبی اور نامانوس ہوں۔ جنہیں اِس کی خالص المیّت خوشی کے ساتھ قبول نہ کر سکے۔" (ایضاً ص ۷۴)

اپنے مقالے کے عنوان اور اِس کے تحت جمیلؔ کے پیشِ نظر بنیادی بحث یعنی "صنفی جذبات

کی ترجمانی'' کے تعلق سے جو چند تنقیدی نکات اور اس کے ضمن میں کلامِ انیسؔ سے جو مثالیں جمیلؔ نے ذکر کی ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے:

''عشقیہ شاعری اس کے مزاج کے موافق نہ تھی اس لیے کربلا کی داستان میں ایسے گوشے موجود ہونے کے باوجود انھوں نے ان کو نظر انداز کر دیا۔ عروسِ قاسم کی روایت ایک ایسی روایت تھی جس میں انیسؔ اگر چاہتے تو عاشقانہ شاعری کا رنگ بھر کے رومان پسند طبیعتوں کی دلچسپی کا سامان پیدا کر سکتے تھے۔ لیکن اول تو انیسؔ کا سلیقۂ سخنوری المیہ شاعری کے سوز کو عشقیہ شاعری کے ساز سے مخلوط کرنا ایک فنی بے اعتدالی سمجھتا تھا۔ دوسرے انیسؔ کی مذہبی عقیدت مندی بھی حفظِ مراتب کے ماتحت خاندانِ رسالت کے افراد کے ساتھ اِس قسم کی جسارت کو ایک گستاخی سمجھتی تھی۔ اس لیے انھوں نے عروسِ قاسم کی روایت بیان کرتے ہوئے گھریلو معاشرے کی جھلکیاں تو دکھلائیں لیکن اس سے آگے بڑھنے کی جرأت نہ کر سکے۔'' (ایضاً ص ۴۷)

امید ہے کہ آپ اِن اقتباسات سے دوگونہ حظ حاصل کر رہے ہوں گے۔ اس لیے کہ اس میں جمیلؔ مظہری جیسے شاعر کا تنقیدی شعور اور اُن کے قلم سے انیسؔ جیسے عظیم شاعر کے مزاج و منہاجِ فکر و فن کا تجزیہ دونوں چیزیں بیک وقت سامنے آرہی ہیں۔ اور پھر بہ طورِ خاص جب بات انیسؔ کے تعلق سے ہو تو کون ایسا بد مذاق ہوگا جو بیش از بیش بحث و کنجکاوی سے محظوظ نہ ہو۔ سلسلۂ بحث کی ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے، جمیلؔ لکھتے ہیں:

''دوسری روایت شیریں کی ہے جو واقعۂ کربلا کے سلسلے میں بیان کی جاتی ہے۔ اِس میں جنسیاتی عشقیہ شاعری کا رنگ بڑی حد تک پیدا کیا جا سکتا تھا مگر انیسؔ اپنے المیہ کو اِس حد تک عشقیہ بنانا پسند نہیں کرتے .... واقعہ یوں ہے کہ امامِ حسینؑ کی بی بی شہر بانو شہنشاہِ عجم کی دختر تھیں۔ ان کی کنیزانِ خاص میں ایک کنیز شیریں نامی تھی۔ ایک دن امام حسینؑ نے اس کی خوش چشم کی تعریف کردی۔ حضرت بانو نے اپنے مقدس شوہر کی اس تعریف کو ایک جنسی میلان سمجھ کر وہ کنیز حضرت امام کو ہبہ کردی۔ امام نے شہر بانو کے اس جذبۂ شوہر پرستی کی

تہہ میں جو عورت کا جذبۂ رشک چھپا تھا، اس کو بھانپ کر اس کنیز کو آزاد کردیا۔ کنیز مدینے سے چلی گئی۔ عراق کے کسی حصّے میں پہنچ کر اس نے ایک یہودی کو مسلمان کر کے اس سے شادی کرلی۔ مدینے سے رخصت ہوتے وقت اس نے امام سے وعدہ لیا کہ وہ کبھی نہ کبھی اس کے گھر ضرور آئیں گے۔ کچھ دنوں کے بعد واقعہ کربلا پیش آیا۔ امام حسینؑ خود تو شیریں کے یہاں نہیں پہنچ سکے لیکن ان کے اہل حرم کا لٹا ہوا قافلہ امام حسینؑ کے سر بریدہ کے ساتھ شیریں کے علاقے سے گزرا۔ شیریں نے اپنے آقا کی اس وعدہ وفائی پر صف ماتم بچھائی۔ اس واقعے کو انیسؔ نے کئی مرثیوں میں بڑی سادگی مگر انتہائی تاثیر کے ساتھ نظم کیا لیکن حسن وعشق کی کوئی چھینٹ بھی اس پر پڑنے نہ دی۔ واقعے کی ابتدا میں صرف اس قدر کہہ سکے ۔

بانو سے جو مانوس شہنشاہ زمن تھے
کچھ پیار کی باتیں تھیں، محبت کے سخن تھے

جب شیریں بنا سنوار کے حضرت کی خدمت میں پیش کی گئی تو امام نے اپنے جذبات کا اظہار صرف ایک مصرع میں یوں فرمایا ع

جب تم سی ہو بی بی تو کچھ ارمان نہیں ہے

اور شیریں کو آزاد کردیا۔ شیریں کے جو جذباتِ عقیدت امام حسینؑ سے وابستہ تھے، انیسؔ اگر چاہتے تو انھیں رادھا کی کرشن بھگتی کی طرح اچھال کر عشق کی ایک فراقیہ داستان بنا سکتے تھے۔ اور ظاہر ہے اس داستان میں امام حسینؑ کی ذاتِ گرامی کے ساتھ کسی سوءِ ادب کے سرزد ہونے کا امکان بھی نہیں تھا۔ جذبات عشق صرف شیریں سے منسوب کیے جا سکتے تھے۔ لیکن انیسؔ کی نظر میں المیہ شاعری کا جو معیار تھا ایک ایسی عشقیہ داستان اس سے میل نہ کھاتی تھی۔

(ایضاً ص ۷۴۔۷۵)

انیسؔ کے مزاج، اُن کی مذہبی عقیدت، اُن کے اخلاقی شعور، اُن کے مخصوص فن کے موضوع اور فنی تقاضے، مرثیہ میں عشقیہ مضامین پیدا کرنے کے امکان کی نشاندہی ،لیکن المیہ کے سوز سے عشقیہ ساز

کی عدمِ مناسبت وغیرہ کی صراحت کے بعد جمیؔل مظہری نے علمدارِ فوج حسینی حضرتِ عباس علیہ السلام کی شہادت پر اُن کی زوجہ کے بین کے ضمن میں حسبِ موقع صنفی جذبات کی ترجمانی بھی انیسؔ کے قلم سے دکھائی ہے اور اسی طرح خاندانِ رسالت کی مختلف خواتین کے جذبات حسبِ موقع، سن وسال اور رشتہ کے مطابق دکھائے ہیں۔ انیسؔ کے کلام سے مختلف بند، بیتیں اور مصرعے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''یہی وہ مقامات ہیں جہاں بلاغت انیسؔ کے قلم کا منہ چومتی ہے۔'' اور یہ کہ:

> ''انیسؔ پر اعتراض ہے کہ انھوں نے خاندان رسالت کی خواتین کو بے صبری کے ساتھ نوحہ کناں دکھلایا ہے لیکن یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ اُن کا شعورِ فطرت نگاری کیفِ سخنوری کے عالم میں سب کچھ بھُلا دیتا ہے۔ صرف ایک چاہنے والی بہن، ایک کوکھ جلی ماں اور سہاگ لٹی دلھن اُن کے پیشِ نظر رہتی ہے۔'' (ایضاً ص ۷۷)

میر انیسؔ پر جمیؔل مظہری کا دوسرا مقالہ حقیقتاً چونکا دینے والے عنوان کا حامل ہے، ''انیسؔ کی نامقبولیت کے اسباب''! ۔ اس مقالہ کے لکھنے کا سبب تو یہ تھا کہ ''انیسؔ صدی'' سے چند برس پیشتر ''غالبؔ صدی'' منائی گئی تھی، جس میں انیسؔ صدی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ جوش وخروش کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ لیکن جب انیسؔ صدی منانے کا مرحلہ آیا تو فی الجملہ اردو والوں کی طرف سے اتنا جوش وخروش دیکھنے میں نہیں آیا۔ جمیؔل مظہری نے اِسی پس منظر میں یہ مقالہ لکھا لیکن انہوں نے اِس عنوان کے تحت بہت تفصیل کے ساتھ بہت سے ادبی، معاشرتی اور سیاسی عناصر ومسائل کا احاطہ اور تجزیہ کیا ہے۔ جمیؔل نے ''انیسؔ کی نامقبولیت'' کا اُدبی سماجی عنصر اردو دُنیا کی غزل پرستی کو قرار دیا ہے۔ اُن کی بات بہر حال بہت قابلِ غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''انیسؔ کی عدم مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے وطن کی اردو دُنیا تغزّل کی کیفیات سے اِس طرح مسحور ہے کہ واقعہ نگارانہ یا غیر عاشقانہ شاعری کا ذوق ہی نہ بالیدہ ہو سکا۔ مسدس حالیؔ کی نامقبولیت کا بھی یہی راز ہے۔''

> ''اقبالؔ نے اِسے سمجھ کر اپنی نظموں کو غزلوں کا روپ دے دیا تھا۔ ترکیب بند ان کی جتنی اسلامی نظمیں ہیں اُن کا ہر بند ایک غزل ہے۔ اِس طرح جب تغزّل پسند ذہنوں کو اپنے اس طرزِ بیان سے مانوس بنالیا تو پھر رفتہ رفتہ اس

رنگ کو ہلکا کرتے گئے۔"

"اقبالؔ سے پہلے انیسؔ کو بھی اِس دشواری سے دوچار ہونا پڑا تھا اور اپنے رزمیہ چہرے میں تیغوں کے علاوہ کہیں کہیں تغزّل کا سیندور دینا پڑا۔ عوام کی بدمذاقی کا اقرار کر کے سپاہی کو معشوق اور تلوار کو دلہن بنانا پڑا۔" (ایضاً: ص ۶۹)

جمیلؔ مظہری کے یہ جُملے بھی بے حد فکر انگیز ہیں کہ:۔

"........اَب رہا رزمیہ شاعری کا سوال تو دوسو سال کی غلامی میں نہ ہمارا ذہن عسکری رہا نہ جذبات، پھر انیسؔ کی طرف متوجہ ہونے کا کیا سوال تھا۔"

جمیلؔ مظہری نے اِس کے علاوہ کلامِ انیسؔ کی اشاعت میں بے احتیاطی، اردو کے بیشتر اہل ذوق کی انیسؔ کے بہترین کلام تک نا رسائی، اردو کی نصابی کتابوں میں بھی انیسؔ کے دوسرے درجہ کے کلام کی شمولیت اور اسی طرح انیسؔ ناشناسی یا انیسؔ اور اُن کے فن کی ناقدری کے متعدد اسباب و عوامل کا ذکر کیا ہے جس میں سے ایک یہ بھی ہے جسے اُنہیں کے الفاظ میں پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے:۔

"....انیسؔ عزادارانِ حسینؑ کے حلقے میں جو اُن کے مخاطبِ اوّل تھے مقبول سہی، اِس کے علاوہ .... علامہ شبلیؔ کی طرح وسیع النظر اور وسیع المشرب .... مقبول سہی، لیکن پھر بھی ہندوستان کی اردو بولنے والی دُنیا انھیں پوری طرح جانے پہچانے ہوئے نہیں ہے اور عدم مقبولیت کا یہاں سوال نہیں کیونکہ یہ دُنیا انیسؔ تو کیا انیسؔ کے ممدوحین کو بھی نہیں پہنچانتی۔ کیوں نہیں پہچانتی۔ اس کی (بہت کچھ) ذمہ داری انیسؔ کے مخاطبین اوّل پر ہے .... ہندوستان کا ہر مسلمان بچہ بھی رام، سیتا، لکشمن کو جانتا ہے لیکن جن شہروں اور دیہاتوں میں عزاداری برپا ہوتی ہے اُن کا کوئی بالغ ہندو نہ حسینؑ کو پہچانتا ہے نہ عباسؑ کو، نہ زینبؑ کو۔ پھر اگر وہ مداحِ اہلبیت میر انیسؔ کو نہ پہچانے تو اس سے کیا گِلہ ہو سکتا ہے۔" ..... "اِس سے انکار نہیں .... کہ .... ماضی کے ہندو بڑی حد تک واقعۂ کربلا اور اس کے جانباز مجاہدوں .... سے ناواقف نہ تھے۔ بلکہ بڑی حد تک .... عزاداری کی سرگرمیوں میں حصہ دار بھی ہوا کرتے تھے۔ لیکن اِدھر چالیس سال سے یہ باہمی یکجہتی کا سلسلہ ختم ہو گیا .... اس خلیج کی ذمہ

داری (بڑی حد تک) مسلم لیگ اور نیشنل کانگریس کی سیاست پر ہے۔"

(ایضاً: ص ۶۷، ۶۸)

اِن دو مقالات کے علاوہ جمیؔل نے انیؔس کے تعلق سے اپنے ایک اَور مقالے "میر انظریۂ شعر اور میری شاعری" میں جن تأثرات کا اظہار کیا ہے وہ بھی قابلِ توجہ ہے:

"اردو کے تمام شعراء میں نظیر اور انیؔس مجھے سب سے زیادہ پسند اس لیے ہیں کہ انھوں نے اپنے ماضی و حال کے مختلف انسانوں کے مختلف جذبات کی کامیاب ترجمانی کی ہے۔" (ایضاً: ص ۲۵۳)

"انیؔس کے یہ مصرعے: ؎ ناخدا جاتا ہے گھر جانے اور اَب تُم جانو

؎ بھائی بڑا ہے سر پہ تو سایہ ہے باپ کا

جن جذبوں کی شدت کے ترجمان ہیں وہ بھی ہماری زندگی میں بڑا دخل رکھتے ہیں۔ یہ شاعر کی کم نظری تھی کہ اُس نے تمام جذبوں سے منھ موڑ کر صرف اسی جذبے کو ترجمانی کا حقدار سمجھا جو ایک مرد کے دل میں عورت کے لیے اور عورت کے دل میں مرد کے لیے پیدا ہو کر اپنی محرومی اور نارسائی کی نوحہ خوانی کرتا ہے۔ یہی وہ تصور ہے جس نے ہماری شاعری کے معنوی دائرہ کو محدود سے محدود تر کر رکھا ہے اور یہی وہ شعور ہے جس نے رشید احمد صدیقی کی زبان سے انیؔس کے اشعار کو اُردو کی آبرو کہلوایا۔" (منثورات جمیؔل ج ۲ ص ۲۵۳، ۲۵۴)

(۳)

شعری خراجِ تحسین اور تنقیدی آراء و نظریات سے قطعِ نظر، بحیثیت شاعر جمیؔل مظہری کے تخلیقی سفر میں انیؔس کے فکر و فن کی دھوپ چھاؤں تلاش کرنا بھی چنداں دشوار نہیں۔ بلکہ یہ مطالعہ بجائے خود ایک نہایت خوش گوار اور تخلیق افزا ادبی سیر و سلوک اختیار کرنے کے مترادف ہوگا۔

جمیؔل مظہری نے تقریباً سبھی اصنافِ سخن میں بہتر سے بہتر فن پارے تخلیق کیے لیکن بعض اصحابِ رائے کے مطابق اُن کے یہاں "نظم نگاری" کا پلہ زیادہ گراں نظر آتا ہے کلام کی اشاعت کے سلسلے میں بھی پہلے اُن کی نظموں ہی کا مجموعہ "نقشِ جمیؔل" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ جس کے دیباچہ نگار نے بہ صراحت لکھا تھا:

"غالبؔ وانیسؔ کو وہ خدائے سخن سمجھتے رہے۔ اور یہی سبب ہے کہ اُن کے کلام میں اِن دونوں کی تقلید کا رنگ نمایاں ہے۔" (نقشِ جمیلؔ ص ۱۴)

جمیلؔ کے اِس مجموعۂ منظومات میں "انتساب" کی عبارت کے علاوہ خود اُن کے قلم سے کوئی نثری یا شعری دیباچہ نہیں ہے۔ اس کے مرتب۔۔۔ نے جمیلؔ کے ایک مرثیہ کے دو بند "آغازِ کتاب" کے طور پر استعمال کیے ہیں۔ جن میں غالبؔ اور انیسؔ دونوں کے لہجوں کو سمو کر اپنا ایک منفرد لہجہ بنانے کی سعیِ جمیل قابلِ دید ہے:

جنبش سے میرے خامۂ افسوں طراز کی۔ کھلتی ہے آنکھ اُس گرہِ نیم باز کی
دَم جس کا گھٹ رہا تھا کشاکش میں راز کی۔ مصرعے نہیں شکن ہیں حجاباتِ ناز کی
دِل کے دیئے جلیں گے محبت کے دیس میں
نکلا ہے حُسن لفظ و معانی کے بھیس میں

آواز میں بھی حُسن ہے اور خامشی میں بھی — تنظیم میں بھی حُسن ہے آشفتگی میں بھی
یوں تو ظہورِ حُسن کا ہے راستی میں بھی — اِک بانکپن ضرور ہے لیکن کجی میں بھی
سچ پوچھیئے اگر تو بصیرت میں حسن ہے
آنکھوں میں روشنی ہو تو ظلمت میں حسن ہے



غالباً اس صراحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ اِن بندوں میں تو انیسؔ کا اثر ہی غالب نظر آ رہا ہے۔

جمیلؔ مظہری کو انیسؔ کے فیضانِ فکر و فن سے متمتع ہونے کے خالص ادبی اور خالص مذہبی دونوں مواقع فراہم ہوئے۔ خالص مذہبی موقع تو اُن کے خاندانی پسِ منظر اور گھریلو ماحول نے فراہم کیا۔ وہ ماحول جس کا اندازہ جمیلؔ کے ایک مرثیہ کے اس مقطع سے بخوبی ہو جاتا ہے ؎

بس اے جمیلؔ مانگ اَب اِس نظم کا صلہ — کر عرض ہاتھ اُٹھا کے کہ اے ربِّ دوسرا
اَجر اس کا میرے باپ کو دے اے مرے خدا — وہ باپ جس کا فیض ہے یہ جذبۂ وِلا
مسلک تھا جس کا مدحِ شہِ مشرقین کی
دیں جس نے لوریاں مجھے نامِ حسینؑ کی! (ص ۹۳)

اور وہ ماحول جسے خود جمیلؔ نے بھی بڑی حد تک باقی رکھا اور اپنے بعد کی نسل کو بھی ایسے ہی ماحول میں پروان

چڑھانے کی کوشش کی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بیٹے (دراصل بھتیجے) حسن خورشید مظہری سلمہٗ کو اُن کے لڑکپن میں منبر پر بٹھایا اور ایک مرثیہ پیش خوانی کے لیے کہہ کر دیا۔ جس میں انیسؔ کی "تقلید" اِس حد تک موجود ہے کہ اِس مرثیہ کے ابتدائی دو بندوں میں انیسؔ ہی کی دو بیتیں جمیلؔ نے اپنالی ہیں:

بخدا بندۂ موروثیِ مَولا ہوں میں — مدح خواں شاہ کا مثلِ جدوآبا ہوں میں
جس میں ہے پرتوِ خورشید وہ ذرہ ہوں میں — قرۂ جمیلِ سخن آرا ہوں میں
"عمریں گذری ہیں اِسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مدّاحی میں"

اِس ثناخواں کے بزرگوں میں ہیں سب اہلِ نظر — قیصرؔ و احمدؔ و خورشیدؔ و نظیرؔ و اظہرؔ
عمِ ذی قدر رضاؔ شاعرِ والا گوہر — مظہری میں بھی ہوں از نسبتِ نسلِ مظہرؔ
"جو بھی افضالِ الٰہی سے ہوا نیک ہوا
نام بڑھتا گیا جب ایک کے بعد ایک ہوا"

ہے مرا ذوقِ سخن جوشِ طبیعت کی دلیل — میرے افکار رسا سایۂ بالِ جبریلؑ
میرے سینے میں ہے میراثِ بزرگانِ جلیل — میں وہ ہوں جس کو ملی راحتِ آغوشِ جمیلؔ
شاعری کھیل مرا بازیِ طفلی کی جگہ
مرثیے میں نے سُنے گود میں لوری کی جگہ

جمیلؔ کو انیسؔ کے خالص ادبی فیضان سے استفادے کا موقع خود اُن کے تخلیقی سفر میں حاصل ہُوا۔ حقیقت یہ ہے کہ جمیلؔ کی فطری موزونیت اور فکری جودت کو ابتداءً، ارتقاءً اور انتہاءً ایک اعلیٰ تخلیقی خصوصاً شعری سطحِ اظہار و بیان تک لانے میں انیسؔ کا مسلسل مطالعہ بہت کام آیا۔ لیکن جمیلؔ کا تخلیقی، تنقیدی اور سب سے بڑھ کر اُن کا تہذیبی شعور چونکہ غزل اور سلام نیز عام نظموں اور مرثیوں کے درمیان ایک بڑے امتیاز کا قائل تھا اس لیے انیسؔ سے استفادے اور بھرپور استفادے کا رنگ فطری اور قہری طور پر جمیلؔ کے مرثیوں میں ظاہر ہُوا۔ جسے ان مرثیوں کا مطالعہ کرنے والا کوئی بھی صاحب نظر بآسانی مشاہدہ کرسکتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جہاں جہاں جمیلؔ نے "رزمیہ" کے آہنگ اور اس کے لوازم کو برتنے کی کوششیں کی ہیں وہ انیسؔ کے آفتاب ہُنر کی شفاف اور تیز دھوپ میں شرابور نظر آتے ہیں۔ اور بے ساختہ پکار اُٹھتے ہیں ع

لاؤں کہاں سے نطقِ انیسؔ سخن طراز!

اس لیے کہ انیسؔ فکر و فن کی اُس بلندی پر ہیں کہ اُن کے بعد کا کوئی بھی شاعر نہ اُن کے فکری استحکام اور ایقان

تک پہنچ سکا نہ اُن کے کمالِ فن تک رسائی حاصل کر سکا۔ پروفیسر عبدالمغنی کی یہ رائے اس باب میں یقیناً قولِ فیصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ لکھتے:

> ''انیس کا امتیاز یہ ہے کہ اُن کی فکر مستحکم، واضح اور موٴثر ہے اسی لیے انیس کے مراثی میں ضمنی طور پر بھی جو عملی پہلو کے جہادیہ اشعار ہیں وہ ان تمام جدید مرثیہ گویوں کے پورے سرمایے پر بھاری ہیں جنہوں نے خاص عملی پہلو کو اپنی مرثیہ نگاری کا موضوع بنایا۔''

(عبدالمغنی، جمیلؔ مظہری کی مرثیہ نگاری، شاعر بمبئی جلد ۵۳ شمارہ ۱ص ۴۴)



☆ رزمیہ تعریف کے نقطۂ نظر سے مغربی اور قدیم ہندوستانی فکر کی روشنی میں جب ہم اردو شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں بہت زیادہ مایوسی کا شکار نہیں ہونا پڑتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ رزمیہ کا جو متعین ہیئتی نظام ہے وہ ہمیں اردو شاعری میں نہیں ملتا۔ لیکن ادبی رزمیہ کے مختلف عناصر ہمیں میر انیسؔ کے یہاں پورے جاہ و حشم کے ساتھ دستیاب ہو جاتے ہیں۔ (اس ضمن میں قدیم ہندوستانی شعریات کے ایک بہت اہم نظریہ، اس دبستان کے اعتبار سے میر انیسؔ اردو کے سب سے بڑے شاعر ثابت ہوتے ہیں)

☆ عنبر بہرائچی ، دیباچہ لمحات نظیر کی فی نظر ص ۱۶، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔ ۱۹۹۶

سیدہ زینب غروی

میر انیسؔ کی غزل گوئی

انیسؔ کی غزل گوئی خود میر انیسؔ کی شخصیت کے تعلق سے ذرا بھی قابلِ بحث عنوان نہیں ہے۔ پھر بھی نگاہِ تحقیق کی ذرّہ بینی ایسے بھی عنوانات پر خامہ فرسائی کا جواز فراہم کر دیتی ہے۔ سوانح نگاری کی جزئیات طلبی کے تقاضوں کے تحت محققِ بزرگوار پروفیسر ڈاکٹر نیّر مسعود کو بھی اس عنوان سے تعرض کرنا پڑا ہے۔ نیّر مسعود نے اِس باب میں جو کچھ لکھا ہے اس سے بغیر کسی اختلاف کے محض استدراکِ بحث کے طور پر یہ چند سطریں لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

انیسؔ کا ذکر اردو شعراء کے جن ابتدائی تذکروں میں پایا جاتا ہے اُن میں سے ایک ''گلستانِ سخن'' بھی ہے۔ جس کے مولف مرزا قادر بخش صابرؔ دہلوی ہیں۔ یہ تذکرہ مجلسِ ترقی ادب لاہور سے جناب خلیل الرحمٰن داؤدی کی تحقیق و ترتیب کے ساتھ شایع ہو چکا ہے۔ اس کی پہلی جلد میں انیسؔ کا ذکر درج ذیل عبارت میں پایا جاتا ہے۔

> ''انیسؔ تخلص'' میر ببر علی پسر میر مستحسن پسر میر حسن صاحب مثنوی ''بدرِ مُنیر'' ساکن لکھنؤ۔ خوش فکر و تیز طبع ہے۔ ہر چند غزل گوئی میں دست گاہِ تمام اور قوّتِ مالا کلام ہے، لیکن غلوِ اعتقادِ ائمہ عظام (کذا) سے اوقات عمر کو مرثیہ گوئی میں صرف کیا اور حق یہ ہے کہ اس نظم میں فصاحت و بلاغت کی داد دی ہے۔ تحت لفظ یعنی مرثیہ بغیر آہنگِ موسیقی کے ایسی طرز سے پڑھتا ہے گویا عنانِ اثر اس کی صدائے دل سوز کے ہاتھ میں ہے۔ یہ شعر اُس کے افکار سے مرقوم ہُوا:
>
> ؎ ہوا ہے، ابر ہے، ساقی ہے مَے ہے
> پر اک تو ہی نہیں، افسوس ہے ہے''
>
> (گلستانِ سخن، ص ۲۸۰)

اِس تذکرہ نگار کی یہ شہادت کہ ''غزل گوئی میں دست گاہِ تمام اور قوّتِ مالا کلام ہے'' نہ بلا وجہ ہے نہ غیر اہم۔ اور یہ عبارت ناصرؔ کی اِس عبارت سے کہ ''عالمِ شباب میں چندے مشقِ غزل

گوئی رہی'' جتنا تفاوت رکھتی ہے، ظاہر ہے۔ بلکہ بڑی حد تک یہ اُس بیان کی توثیق کرتی ہے جو شریف العلماء نے آزاد کے نام خط میں خود انیس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ''جب مُشاعرے میں غزل پڑھتا تو دو چار دس آدمی رو کر لوٹنے لگتے اور میر خلیق کے سامنے ..... ذکر ہوتا کہ انیس خوب پڑھتے ہیں.....''

ناصر نے انیس کے تذکرے کے ضمن میں ایک غالباً مکمل غزل اور تین متفرق اشعار بھی دیے ہیں جو درجِ ذیل ہیں:

غزل

شہیدِ عشق ہوے قیسِ نامور کی طرح — جہاں میں عیب بھی ہم نے کیے ہنر کی طرح
کچھ آج شام سے چہرہ ہے فَق سحر کی طرح — ڈھلا ہی جاتا ہوں فرقت میں دوپہر کی طرح
سیاہ بختوں کو یوں باغ سے نکال اے چرخ — کہ چار پھول تو دامن میں ہوں سپر کی طرح
تمام خلق ہے خواہانِ آبرو یارب ! — چھپا مجھے صدفِ قبر میں گہر کی طرح
تجھی کو دیکھوں گا جب تک ہیں برقرار آنکھیں — مری نظر نہ پھرے گی تری نظر کی طرح
انیس یوں ہُوا حالِ جوانی و پیری — بڑھے تھے نخل کی صورت گرے ثمر کی طرح''

اربابِ ذوق محسوس کر سکتے ہیں کہ یہ غزل انیس کے سلاموں کے عمومی معیار سے بہت دُور نہیں ہے۔ خصوصاً یہ شعر۔

تما خلق ہے خواہانِ آبرو یارب — چھپا مجھے صدفِ قبر میں گُہر کی طرح

ناصر نے اس غزل کے علاوہ جو تین متفرق اشعار درج کیے ہیں وہ یہ ہیں:

خموش اے بلبلِ شوریدہ اس میں کیا ہے بَس میرا — یہ اپنی اپنی قسمت ہے چمن تیرا قفس میرا
بنے یوں تین دردریا کے اندر — کہ ششدر ہو گئی سدِّ سکندر
یہی باعث ہے اس بے رحم کے آنسو نکلنے کا — دھواں لگتا ہے آنکھوں میں کسی کے دِل کے جلنے کا

(سعادت خاں ناصر، خوش معرکۂ زیبا، مرتبہ مشفق خواجہ، ج اص ۴۰۱ ۴۰۰، طبع اول: اپریل ۱۹۷۰ء مجلس ترقی ادب لاہور)

ناصر کی روایت کردہ غزل اور اشعار دیکھنے کے بعد بھی نیّر مسعود کی یہ رائے اپنی جگہ درست نظر آتی ہے کہ ''انیس کا جو غزلیہ کلام ہم تک پہنچا ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ اُسے سُن کر لوگ اِس طرح تڑپ جائیں......... الخ''۔ اس کی ایک سے زیادہ وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔ پہلی وجہ تو انیس

کی وہ طمانیت و مانعیتِ نفس ہے جو اُن کی خاندانی اور ذاتی، شعری اور فنّی وجاہتوں کے ساتھ مرثیہ کے میدان میں ان کی بے نظیر کامیابیوں اور شہرت کی زائیدہ تھی، اور جو صرف خود کو ہمہ جہت شاعر و فن کا اور ہمہ داں استاد ثابت کرنے کے لیے تمام مروجہ اصنافِ سخن خصوصاً غزل میں مشق و ممارست بہم پہنچانے اور اِن تمام اصناف میں اپنے کلام کو مرتب اور محفوظ کرنے سے مانع رہی۔

دوسری وجہ وہی ہے جسے بیشتر حضرات نے ذکر کیا ہے لیکن مولانا محمد باقر شمس نے اسی بات کو ذرا انوکھے انداز سے بیان کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب ''لکھنؤ کی شاعری'' میں ''لکھنؤ کی غزل کا ایک اور طرز۔ سلام'' کے ذیلی عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

> ''لکھنؤ میں غزل کی ایک قسم سلام بھی ہے۔ میر انیسؔ نے اپنے نواسے رشید صاحب سے کہا تھا کہ ہماری غزل ہمارا اسلام ہے۔''
>
> ''محمد جعفر صاحب امیدؔ نے غزل میں جو اصلاح تجویز کی تھی یعنی رندی و شاہد پرستی کے مضامین، واعظ و ناصح کی تضحیک، حضرتِ خضر کی عمر، حضرت عیسیٰ کا معجزہ، حضرت یوسف کے حسن کی تخفیف (کذا۔ مراد: اِستخفاف) سے اجتناب، معشوق کو حالتِ اطلاق میں رکھنا، اِسی کو حالیؔ نے اپنے نام سے (کذا) مقدمۂ شعر و شاعری میں اصلاح غزل کے عنوان سے پیش کیا تھا۔ مگر وہ دونوں (امیدؔ اور حالیؔ) اِس رنگ میں اچھے شعر نہ کہہ سکے اور یہ اصلاح مردود و متروک ہوگئی۔ مرثیہ گویوں نے اِسے معراجِ کمال تک پہنچایا۔ انھوں نے سلام کو غزل بنالیا۔ ابتدا میں سلام کی وضع یہ تھی کہ مطلع مجرئی، سلامی، سلام یا السلام سے شروع ہوتا اور مقطع تک فضائل و مصائب کی فضا قائم رہتی تھی۔ مرثیہ کی ترقی کے ساتھ سلام کو بھی ترقی ہوئی۔ مطلع میں سلامی یا سلام شاذ رہ گیا اور غزل کے مضامین سوائے رندی و اوباشی کے سب داخل کر لیے (گئے) دو ایک شعر واقعۂ کربلا کے متعلق ضرور ہوتے تھے۔ اس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ ہر شاعر غزل سے اپنی شاعری کی ابتداء کرتا ہے۔'' (لکھنؤ کی شاعری صفحہ ۲۶۵)

مولانا محمد باقر شمس مزید لکھتے ہیں:

"جو شاعر غزل اور مرثیہ دونوں کہتے رہے اُنھیں چھوڑ کے جن شعراء نے غزل ترک کردی انہوں نے اپنی غزلوں کو سلام بنالیا۔ غزل کے سنجیدہ شعر سلام میں آگئے۔ جس طرح امیدؔ اور حالیؔ چاہتے تھے۔" مثال میں میر انیسؔ کو دیکھیے اُن کی غزل ہے۔

اشارے کیا نگہ ناز دلربا کے چلے — جب ان کے تیر چلے نیمچے قضا کے چلے
پکارتی تھی حسرت سے لاش عاشق کی — صنم کہاں ہمیں تم خاک میں ملا کے چلے
کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی — چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے
تمام عمر جو کی سب نے بے رخی ہم سے — کفن میں ہم بھی عزیزوں سے منہ چھپا کے چلے
مثال ماہی بے آب موج تڑپا کی — حباب پھوٹ کے روے جو وہ نہا کے چلے
مقام یوں ہوا اس کارگاہ دنیا میں — کہ جیسے دن کو مسافر سرائے میں آ کے چلے
رہی غرور سے نفرت سیاہ کاروں کو — قلم کی طرح چلے جب تو سر جھکا کے چلے
ملا جنھیں انہیں افتادگی سے عوج ملا! — انھیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اُٹھا کے چلے

انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

انیسؔ نے اس غزل کو یوں سلام بنایا۔

گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے — خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے
مقام یوں ہوا اس کارگاہ دنیا میں — کہ جیسے دن کو مسافر سرائے میں آ کے چلے
خیال آ گیا دنیا کی بے ثباتی کا — چلے جہاں سے جو اصغرؑ تو مسکرا کے چلے
کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی — چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے
خرام اسپ شہ دیں سے دینگے ہم تشبیہ — کہاں ہے کبک دری چال نو بتا کے چلے
ملا جنھیں انھیں افتادگی سے اوج ملا — انہیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے چلے
حسینؑ کہتے تھے وا حسرتا علی اکبرؑ — بہار باغ جوانی ہمیں دکھا کے چلے
ملک پکارے کہ الٹا زمین کا طبقہ — حسینؑ فوج پہ جب آستیں چڑھا کے چلے

اس میں تین عشقیہ شعر حذف کرکے بقیہ تین شعر بڑھائے ہیں۔"

اس کے بعد مولانا شمس نے کچھ اور نمونے انیسؔ کے سلام یا غزل کے اشعار کے دیے ہیں جنہیں تمام و کمال یہاں اس لیے نقل کیا جا رہا ہے تاکہ اس بحث سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے تمام متعلقہ نکات اور امثال جمع ہو جائیں۔ مولانا باقر شمس آگے لکھتے ہیں:

''اس غزل کو سلام بنانے کے لیے انیسؔ نے بَیِّنیہ اشعار زیادہ لکھے ہیں لیکن بعض میں ایک آدھ (ہی) شعر بَیِّنیہ ہے جیسے ؎

نمود و بود کا عاقل حباب سمجھے ہیں — وہ جاگے ہیں جو دُنیا کو خواب سمجھے ہیں

کبھی برا نہیں جانا کسی کو اپنے سوا — ہر ایک ذرّہ کو ہم آفتاب سمجھے ہیں

کریم مجھ کو عطا کر وہ فقر دنیا میں — کہ فخر رسالت مآب سمجھے ہیں

بھگو گے کے کھاتے ہیں پانی میں نان خشک کو وہ — اس آبرو کو جو موتی کی آب سمجھے ہیں

ابوتراب کے در کا ہے ذرّہ بیقدر — ہم آسماں پہ جسے آفتاب سمجھے ہیں

یہ اشک تاک ہے کہتے ہیں جس کو آپ طرب — یہ خون گل ہے جسے ہم گلاب سمجھے ہیں

شباب کھو کے بھی غفلت وہی ہے پیری میں — سحر کی نیند کو بھی شب کا خواب سمجھے ہیں

جھکائیں سر کو نہ کیونکر عراق کے فصحا — سوال شاہ کو سب لاجواب سمجھے ہیں

خدا کی راہ میں ایذاء سے جن کو راحت ہے — زمین کرم کو وہ فرش خواب سمجھے ہیں

انیسؔ مخمل و دیبا سے کیا فقیروں کو
اسی زمین کو ہم فرش خواب سمجھے ہیں

اس سلام میں تین شعر تو ایسے بھی ہیں جیسے غزلوں میں بھی ہوتے ہیں صرف آٹھواں شعر ایسا ہے جو غزل کا نہیں ہے۔

ان کے سلام میں بہت سے شعر ایسے ہیں جن میں غزل کا لوچ پوری طرح موجود ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل کا شعر ہے جیسے ؎

بلبلیں دم بھر جدا ہوتی نہیں — کس گل تر کے گلے کا ہار ہوں

کسی کو کیا ہو دلوں کی شکستگی کی خبر — کہ ٹوٹنے میں یہ شیشے صدا نہیں رکھتے

خیال خاطر احباب چاہیئے ہر دم — انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو — خیال صنعت صانع ہے پاک بینوں کو

نمود و بود بشر کیا محیط عالم میں
ہوا کا جب کوئی جھونکا چلا حباب نہ تھا

نہ جانے برق کی چشمک تھی ناشرر کی لپک
ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا

کور ہوتیں اس کا جلوہ دیکھ کر
شکر ہے آنکھوں کا پردا رہ گیا

کریم جو تجھے دینا ہے بے طلب دیدے
فقیر ہوں میں نہیں عادت سوال مجھے

قناعت و گہر آبرو و دولت دیں
ہم اپنے کیسۂ خالی میں کیا نہیں رکھتے

ہمیں تو دیتا ہے رازق بغیر منت خلق
وہی سوال کریں جو خدا نہیں رکھتے

نہ پھیلائیو ہاتھ ہرگز انیسؔ
فقیری میں بھی دل تونگر رہے

کنج عزلت میں مثال آسیا ہوں گوشہ گیر
رزق پہنچاتا ہے گھر بیٹھے خدا میرے لیے

قطع امید ایک در سے گر ہوئی کچھ غم نہیں
اور کچھ سامان کر دے گا خدا میرے لیے

در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے
سر جہاں رکھتے ہیں سب واں ہم قدم رکھتے نہیں

جو مقرر ہے وہ ملتا ہے تری سرکار سے
ہم ہیں صابر کچھ خیال بیش و کم رکھتے نہیں

لحد میں سوئے ہیں چھوڑا ہے شہ نشینوں کو
قضا کہاں سے کہاں لے گئی مکینوں کو

زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا
اسی کو اہل جہاں انقلاب کہتے ہیں

فقیروں کی کیا موت کیا زندگی
جگہ جس جگہ مل گئی مر رہے

شست و شو سے گو ہوا اجلا رزیل
جامۂ اصلی میں دھبا رہ گیا

اسی کا نور ہر ایک شے میں جلوہ گر دیکھا
اسی کی شان نظر آ گئی جدھر دیکھا

ہر نفس آئینۂ دل سے یہ آتی ہے صدا
خاک ہو جاؤ تو حاصل ہو جلا میرے لیے

بھیج دے جنت میں یا دوزخ میں میں مجرم تو ہوں
تو ہے عادل جو مناسب ہو سزا میرے لیے

فقیر دوست جو ہے مجھ کو سرفراز کرے
کچھ اور فرش بجز بوریا نہیں رکھتے

انیسؔ مخمل و دیبا سے کیا فقیروں کو
اسی زمین کو ہم فرش خواب سمجھے ہیں

خاکساری نے دکھائیں رفعتوں پر رفعتیں
اس زمیں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوئے

نوبت جمشید و دارا و سکندر اب کہاں
خاک تک چھانی نہ قبروں کے نشاں پیدا ہوئے

رات اندھیری پرسش اعمال ایذائے فشار
قبر میں بھی چین سے انسان سو سکتا نہیں

کار ذاتی سے ہیں عاجز پاکبازان جہاں
گرد اپنے منہ کی پانی آپ دھو سکتا نہیں

سوؤ گے کب تک بس اب اٹھو انیسؔ — دن بہت غفلت میں تھوڑا رہ گیا
جو غنی ہیں مال دنیا سے ہیں خالی ان کے ہاتھ — اہل دولت جو ہیں وہ دست کرم رکھتے نہیں
دیکھنا کل ٹھوکریں کھاتے پھرینگے ان کے سر — آج نخوت سے زمیں پر جو قدم رکھتے نہیں
نقد جاں تک دے کے ہم جاتے ہیں جانے وقت کوچ — عاریت جو شے ہے اس کو پاس ہم رکھتے نہیں
عالم فانی میں کیا تم کو ملا — اور کچھ اپنی گرہ سے کھو گئے
عالم پیری میں یہ غفلت انیسؔ — رات بھر جاگے سحر کو سو گئے
یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری کے — چنا ہے جامہ اصلی کی آستینوں کو
لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار — خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
غلط یہ لفظ وہ بندش بُری یہ مضموں سُست — ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو
قریب لحد ہم آئے کہاں کہاں پھر کے — تمام عمر ہوئی جب تو اپنا گھر دیکھا
کسی کی ایک طرح سے بسر ہوئی نہ انیسؔ — عروج مہر بھی دیکھا تو دو پہر دیکھا

کچھ انیسؔ ہی پر موقوف نہیں تمام مرثیہ گویوں کے سلام ایسے ہی ہیں اگر ہر دور کے سلام غزل کی طرح پیش کیے جائیں تو ایک دفتر ہو جائے گا۔ اس لیے ہم صرف انیسؔ کا کلام پیش کرتے ہیں یہ ایک بہت اعلیٰ اور سنجیدہ غزل کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے۔'' (لکھنؤ کی شاعری ص ۲۶۶ تا ۲۶۹)

مولانا محمد باقر شمسؔ کے پیش کردہ نکات اور امثال پر دو ایک لحاظ سے غور و تامّل کی ضرورت ہے۔ لیکن فی الوقت اس کی گنجائش نہیں۔

انیسؔ کی غزل گوئی کے مبحث میں ڈاکٹر صغریٰ مہدی کے ایک مضمون کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ ''انیسؔ و دبیر کے کلام میں غزل کا رنگ'' (مشمولہ ''اردو غزل'': مرتبہ ڈاکٹر کامل قریشی) اِس مضمون میں دو ایک نکات کے ضمن میں ۳۳ مختلف اشعار بطورِ مثال پیش کیے گئے ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں:

کس سے اے شوخ ہوئی رات کو ہاتھا پائی — نورتن آج جوڈھلکا ہے ترے بازو سے
ایک وہ دن تھا کہ تکیہ تھا کسی کا زانو — اب سر اٹھتا ہی نہیں اپنے سرِ زانو سے
کل تو آغوش میں شوخی نے ٹھہرنے نہ دیا — آج کی شب تو نکل جاؤ مرے قابو سے

☆

بتا تو دیجیئے صاحب کہاں کا بوسہ لیں ‏ دہن بھی آپ کا مِلتا نہیں کمر کی طرح
چُن کے افشاں نظر اس مہ نے جو کی تاروں پر ‏ آسماں شام سے لوٹا کیا انگاروں پر



پکارے کہتی ہے حسرت سے نعش عاشق کی ‏ صنم کدھر کو ہمیں خاک میں ملا کے چلے

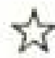


اِن اشعار کو انیسؔ کے دَور کی عمومی روشِ فکرِ سخن، عشق کے خارجی کوائف اور محبوب کی آرائش وزیبائش وہجر ووصال وغیرہ کے بیان کی مثال میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد انیس کے دستیاب سلاموں کے اشعار پیش کیے گئے ہیں جن میں سے کچھ مولانا شمسؔ کے انتخاب میں آچکے ہیں جو اس کے علاوہ ہیں وہ یہ ہیں:

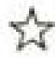
ضبط دیکھو سب کی سن کر پر نہ کچھ اپنی کہی ‏ اس زباں دانی پہ گویا بے زباں پیدا ہوے



اُٹھ گئے مابین سے سارے حجاب ‏ بس فقط آنکھوں کا پردہ رہ گیا
جب گسستہ ہو گیا تارِ نفس ‏ کون سا الفت کا پردہ رہ گیا



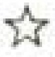
نہ سر اُٹھائیو بحرِ جہاں میں اے غافل ‏ صدا یہ دے گیا پانی پہ جو حباب آیا



محبت کا رشتہ نہایت ہے نازک ‏ مجھے کس لیے قدرداں کھینچتے ہیں



جب زندگی ہو تلخ تو جینے کا کیا مزہ ‏ مجھ کو تو کوئی زہر پلا دے دوا کے ساتھ



بہت ڈر سمندر کی لہروں کا تھا ‏ طبیعت مگر آشنا ہو گئی



بھٹک کے راہ سے پیچھے کہیں نہ رہ جاؤ ‏ اٹھو انیسؔ اٹھو قافلہ روانہ ہوا



انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ　　　　چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے



کوئی انیسؔ کوئی آشنا نہیں رکھتے　　　　کسی سے آس بغیر از خدا نہیں رکھتے



ڈاکٹر صغریٰ مہدی نے اپنے مقالے کے اختتام پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی درج ذیل رائے نقل کر کے انیسؔ کے مرثیوں سے بھی بعض تغزلانہ رنگ و آہنگ سے اشعار نقل کیے ہیں:

فرمان فتحپوری کی رائے ہے کہ: متغزلانہ مزاج اور زبان کا اثر ان کے (انیسؔ کے) مرثیوں میں جا بجا ملتا ہے۔ انھوں نے مرثیہ کے بعض حصوں کو غزل کے آب و رنگ سے بہت قریب کر دیا ہے۔ مثلاً جہاں کربلا کے المیہ کے کرداروں کی آپس کی شدید محبت کا بیان کرتے ہیں، اُن کا سراپا بیان کرتے ہیں۔ حضرت قاسمؑ اور حضرت علی اکبرؑ کے حسن و جمال کا بیان دیکھیے:

غنچوں نے کہا پائے لب ایسے دہن ایسا　　　　باتوں میں مزہ قند کا شیریں سخن ایسا



آنکھیں وہ غزالانِ ختن جن پہ تصدق　　　　رفتار وہ نازک کہ چمن جن پہ تصدق

اور وہ اشعار جن میں انہوں نے شاعری کی تعریف کی ہے۔ جہاں شاعری نے اُن کی محبوبہ کا روپ دھار لیا ہے:

ہے کجی عیب مگر حسن ہے اَبرو کے لیے　　　　سرمہ زیبا ہے فقط نرگس جادو کے لیے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے　　　　زیب ہے خالِ سیہ چہرۂ گل رو کے لیے

اس سے بھی زیادہ گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں انھوں نے غزل کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے:

نازک مزاج و خوش قد و طناز و سر بلند　　　　وہ پیش و پس وسُم وہ کنوتی وہ جوڑ بند
وہ جلد، وہ دماغ وہ سینہ وہ سم وہ چال　　　　دم میں کبھی ہما کبھی ضیغم کبھی غزال
چم خم وہ تیغ کی وہ لگاوٹ وہ آب و تاب　　　　آتش کسی جگہ کہیں بجلی کہیں سحاب

اگرچہ اب تک اِس مضمون میں مولانا محمد باقر شمسؔ، ڈاکٹر صغریٰ مہدی اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے جتنے اقتباسات اور اُن کے پیش کردہ جو بھی اشعار واقعاً انیسؔ کی غزل کے، یا پھر اُن

کے سلاموں اور مرثیوں کے متغزلانہ اشعار نقل کیے گئے اُن پر کئی لحاظ سے غور و تامل اور رائے زنی کی گنجائش موجود ہے بلکہ بعض اشعار کے تعلق سے بحث ضروری بھی ہے تاہم اب اس گفتگو کو کسی اور وقت کے لیے ملتوی کرتے ہوئے سر دست اس بحث کا اختتام پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کے اس جملہ پر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ: ''انیس و دبیر حقیقتاً ایسے عظیم فن کار تھے کہ وہ کسی بھی صنفِ سخن کو اختیار کرتے تو اُسے عظمتِ فن کی بلندیوں سے ہمکنار کرتے۔''



☆ آج کل یورپ میں شاعری کے کمال کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاتا ہے کہ اُس نے اور شعرا نے کس قدر زیادہ الفاظ، خوش سلیقگی اور شایستگی سے استعمال کیے ہیں۔ اگر ہم بھی اسی کو معیارِ کمال قرار دیں، تو بھی میر انیس کو اُردو شعرا میں سب سے برتر ماننا پڑے گا۔ اگرچہ نظیر اکبر آبادی نے شاید میر انیس سے بھی زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں، مگر اُس کی زبان کو، اہلِ زبان کم مانتے ہیں۔ بہ خلاف میر انیس کے، کہ اُس کے ہر لفظ اور ہر محاورے کے آگے سب کو سر جھکانا پڑتا ہے۔ میر انیس کا کلام، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، بلا شبہ مبالغے اور اغلاق سے خالی نہیں، مگر اس کے ساتھ ہی جہاں کہیں وہ واقعات کا نقشا اُتارتے ہیں یا نیچرل کیفیات کی تصویر کھینچتے ہیں، یا بیان میں تاثیر کا رنگ بھرتے ہیں، وہاں اس بات کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ مقتضائے وقت کے موافق جہاں تک کہ امکان تھا، میر انیس نے اُردو شاعری کو اعلا درجے پر پہنچا دیا تھا۔

شمس العلما، الطاف حسین حالی، مقدمہ، ص ۱۹۲، نسخۂ رشید حسن خاں

سید تنویر الحسن

میر انیسؔ اور فنِ مرثیہ خوانی

یہ مختصر نوٹ، جامعہ کلچرل کمیٹی کی طرف سے ۲۰۰۱ء میں منعقدہ، اردو مرثیہ سے متعلق ایک مجلس میں سید تنویر الحسن صاحب نے اپنی تحت خوانی کا نمونہ پیش کرنے سے پہلے اُن سامعین کے سامنے پڑھا تھا جن میں سے بہت کم اس فن سے واقف تھے۔ تنویر الحسن صاحب کے فن کی حقیقی قدر تو اُن کی تحت خوانی کو سننے اور مشاہدے سے ہی محسوس کی جا سکتی ہے مگر اس مختصر نوٹ سے اِس کے کچھ بنیادی نقوش ابھارنے میں مدد مل سکتی ہے۔ (مرتب)

میں نہ تو اردو زبان کا ماہر ہوں نہ ادیب ہوں۔ مرثیہ خوانی ضرور کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرثیہ خوانی بھی مرثیہ گوئی کی طرح ایک اتھاہ سمندر ہے جس کی گہرائی اور وسعت کو استادوں نے بہر طور ناپ لیا تھا۔ مجھ جیسے ہیچمنداں ۵۰ رسال کی مشق کے بعد بھی ساحل سے کچھ ہی آگے بڑھے ہیں۔

اُردو مرثیہ کیا ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہر حال ایک مختصر سا جائزہ بطور تعارف پیش کرتا ہوں۔ اِس تعارفی تحریر میں میں نے اِس صنفِ سخن کے محقق اور ناقد جناب سید مسعود حسن رضوی صاحب ادیب کے مضامین کا سہارا لیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

> ''اُردو مرثیے میں وہ جامعیت ہے کہ اُس کے سامنے شاعری کی دوسری صنفیں محدود نظر آتی ہیں۔ ابتدا میں مرثیے بہت مختصر ہوتے تھے۔ اُن کے مضامین بھی محدود تھے اور اُن کا حلقۂ اثر بھی محدود تھا۔ وہ شکل میں زیادہ تر غزل یا قصیدے سے مشابہ ہوتے تھے۔''

اِن غیر مربوط اشعار میں کربلا کے مختلف واقعات کی طرف اشارے ہوتے تھے۔ سادگی اور خلوص ان کا خاص جوہر تھا۔ رفتہ رفتہ مرثیے نے مُسلسل کلام کی حیثیت اور مربع نظم کی صورت اختیار کرلی۔ اس کا دامن بھی وسیع ہوگیا اور اُس میں

واقعاتِ کربلا کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان ہونے لگے اور تخیل کی کارفرمائیوں اور حُسنِ ادا کی سحرکاریوں کو بھی جگہ ملنے لگی۔

''موضوع میں وسعت کے ساتھ اس کی شکل بھی بدل گئی مُربع سے مُخمس اور پھر مُخمس سے مسدس کی شکل پیدا ہوگئی۔ استادِ فن فصیحؔ۔ دلگیرؔ۔ ضمیرؔ اور خلیقؔ کی کوششوں سے اُردو کا خزانہ مرثیوں کی دولت سے مالا مال ہوگیا۔ رزم کا عنصر مرثیے میں داخل ہوگیا اور مرثیہ شاعری کی ایک اہم اور بلند پایہ صنف بن گیا''۔

اسے Epic کا درجہ مل گیا۔

اِن باکمالوں کے بعد میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے مرثیہ کے اس خاکے میں اور نئے رنگ بھر دیئے۔ میر انیسؔ نے اپنے والد سے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی دونوں فن حاصل کیے اور میر ضمیرؔ کی ادائگی کو بھی اپنایا مگر بہت حد تک اس میں اپنی طبیعت سے بھی ایجاد و اختراع کیں۔

میر انیسؔ نے رزم کے بیان پر بھی خاص زور دیا۔ اجتماعی اور انفرادی جنگوں کے مناظر شاعری کے کمالات کے ساتھ بھرپور انداز سے پیش کیے اور اپنے مخصوص طرزِ خواندگی سے اس میں ڈرامے کی شان پیدا کردی۔ جس طرزِ ادائگی کے میر ضمیرؔ اور خلیقؔ موجد تھے اُسی طرزِ مرثیہ خوانی کو میر انیسؔ نے ایک بہترین فن کا رتبہ عطا کردیا۔ قدرتی طور پر میر انیسؔ کی آواز خوش آیند تھی۔ اُس میں غضب کی دلکشی تھی۔ خود بھی خوبصورت تھے اور منبر پر اس مہذبانہ طریقہ سے بیٹھتے اور پڑھتے تھے کہ سامعین محو ہو جاتے۔

میر انیسؔ غیر شعوری طور پر "Suit the action to the word, the word to the action"- (Hamlet) کے ماننے والوں میں تھے۔ آواز کا اتار چڑھاؤ، ہاتھوں کی متناسب اور مُہذبانہ جنبش، نگاہوں کی گردش ایک جادو کا سا اثر کرتی ہے۔ یہی طرزِ مرثیہ خوانی میر انیسؔ کے دو بھائیوں نے بھی کم و بیش اپنایا۔ میر انیسؔ اور میر مونسؔ نے بھی بہترین مرثیے تصنیف کیے اور وہ انھیں بہت اچھے انداز میں پڑھتے تھے۔ اِسی طرح میر انیسؔ کے صاحبزادے میر نفیسؔ اور اُن کے صاحبزادے، دولھا صاحب عروجؔ، نے فنِ مرثیہ خوانی کو ایک نیا رنگ اور انداز عطا کیا۔

میر اُنسؔ کے صاحبزادے میر وحیدؔ بھی اس فن کے باکمال اُستاد تھے۔

مرثیہ خوانی کے کیا عناصر ہیں جنھیں میر انیسؔ اور اُن کے بعد اُن کے خانوادے نے پیش کیا اس کا اندازہ میر نفیسؔ کے خواندگی سے متعلق ایک واقعہ سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب نے یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے:

> "پنڈت برج نرائین چکبست مرحوم فرماتے تھے کہ میر نفیسؔ کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا شہرہ سُن سُن کر پنڈت بشن نرائین دَر کو اشتیاق ہوا کہ میر صاحب کا کلام خود اُن کی زبان سے سُنیں۔ ایک مجلس میں انہوں نے شرکت کی۔ میں بھی ہمراہ تھا۔ مجلس سے واپس ہوتے ہوئے راستے میں انہوں نے مجھ سے کہا کہ یہ شخص ایکٹنگ کے فن میں انتہائی کمال رکھتا ہے۔ ہندوستان میں اس فن کے ماہر اور اس کے قدر شناس نہیں ہیں۔ اگر یہ باکمال انگلستان میں پیدا ہوا ہوتا تو اس کی شہرت تو دنیا بھر میں ہوتی۔ پنڈت بشن نرائین در نے سچ کہا کہ مرثیہ خوانی کا فن ایکٹنگ کا انتہائی کمال ہے۔ ایکٹر نقل کو اَصل کر دکھانے کے لئے سٹیج کے ساز و سامان کا محتاج ہوتا ہے۔ ہر پارٹ کے لئے اُس کو اُسی کی مناسب پوشاک۔ روپ۔ مقام اور دوسرے لوازم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایکٹر گویا صورت، شکل، لباس، وضع قطع اور اپنے گرد و پیش کی چیزوں میں بالکل ویسا ہی بن جاتا ہے جیسا وہ شخص جس کا کردار اُسے ادا کرنا ہے۔ اپنی چال ڈھال، بو چال، لب و لہجہ میں بھی اُس کی پوری نقل اُتارتا ہے۔ لیکن مرثیہ خوان کا کمال دیکھیے کہ ایک شخص اپنے معمولی لباس اور اصلی صورت میں آتا ہے اور صرف لہجے کی تبدیلی، چہرے کے تغیر۔ جسم اور اعضا کی معمولی سی جُنبش۔ آنکھ کی خفیف سی گردش سے ہر صنف، ہر عمر، ہر حیثیت، ہر استعداد، ہر ذہنی کیفیت والے انسان کی تصویر پیش کر دیتا ہے۔"

ایکٹنگ اور مرثیہ خوانی میں ایک خاص فرق یہ ہے کہ مرثیہ خواں خود کسی دوسرے شخص کی تصویر بھی پیش کرتا ہے اور اپنی ہستی کو بھی قایم رکھتا ہے۔ یہ بڑی نازک بات ہے۔ میر انیسؔ نے اِس فن کو درجۂ

کمال پر پہنچا دیا۔ بعد میں جو بھی فن کار آئے وہ انہیں سے فیضیاب ہوئے۔

اچھی مرثیہ خوانی کے لیے ضروری ہے کہ مرثیہ یاد ہو۔ آواز کی تربیت کے لیے ریاض کرتے رہنا بہت ضروری ہے تاکہ ضرورت کے مطابق لاؤڈ اسپیکر کے سہارے بغیر بھی آواز سامعین تک پہنچ جائے۔ الفاظ اور اشعار کا مطلب اور اِن کی روح کو پوری طرح سمجھنا بھی لازمی جُز ہے تاکہ اُن کی ادائگی صاف ہو اور سامعین کے لیے ان کا مطلب صاف طور پر واضح ہو جائے نیز آواز کے اتار چڑھاؤ اور چہرے اور دیگر اعضا کی خفیف سی حرکات اور اشارات سے تصویر کشی پوری ہو جائے۔

شیکسپیئر نے اپنے ڈرامے Hamlet میں بہت صحیح کہا ہے۔

"Nor do not saw the air too much with your hands, thus, but use all gently; for in the very torrent, tempest, and as I may say, whirlwind of your passion, you must acquire and beget a temperance that may give it smoothness.

But not too tame neither, but let your discretion be your tutor. Suit the action to the word, the word to the action."

۱۸۷۴ء میں جب میر انیسؔ کا انتقال ہوا تو اُن کے ہم عصر مرزا دبیرؔ نے انہیں جن الفاظ میں خراج عقیدت و عزّت وتوقیر پیش کیا اس میں کوئی مبالغہ نظر نہیں آتا۔

آسماں بے ماہ کامل۔ سدرہ بے روح الامیں
طورِ سینا بے کلیم اللہ۔ منبر بے انیسؔ

☆☆☆

تبرکات رفتگاں

☆ اردو کی موجودہ شاعری کی حالت یہ ہے کہ اگر میر انیسؔ صاحب کو شعرائے اردو کے زمرہ سے نکال لیجیے تو اردو کی شاعری فارسی کی شاعری سے بہت پیچھے پڑ جاتی ہے۔ یہ صرف جناب غفراں مآب کا کمال ہے کہ جس کی بدولت اردو کی رزمی شاعری کا پایہ بلند نظر آتا ہے اور اس اعتبار سے اردو کی شاعری نہ صرف فارسی کی رزمی شاعری سے اعلا دکھائی دیتی ہے بلکہ یونانی، لاطینی اور انگریزی شاعریوں سے بھی بہ اعتبار بالا ارفع پائی جاتی ہے۔ لاریب حضرت کی مرثیہ نگاری نے رزمی شاعری کا وہ عالم دکھلایا ہے کہ جس کے مشاہدہ سے عقل دنگ ہو جاتی ہے۔ گو حضرت نے کوئی کتاب رامائن مہا بھارت ایلیڈ اینڈ شاہنامہ یا پیریڈائز لاسٹ کے طور کی منظوم نہیں فرمائی ہے تو بھی رزمی شاعری کا خاتمہ کر دکھایا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کے رزمی شاعری کا جواب دنیا میں بالمیکی اور ویاس کی تصنیفات کے سوا کہیں نہیں پایا جاتا۔

مولانا امداد امام اثرؔ، بہارستانِ سخن یا کاشف الحقائق، ص۳۵۰، نسخہ قومی کونسل برائے فروغ اردو

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب (مرحوم)

میر انس کے سلام پر میر انیس کی اصلاح

میر انس کے ایک سلام پر میر انیس کی اصلاحیں خود ان کے قلم کی لکھی ہوئی میں نے دیکھی ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

۱۔ جھونکا چلے جو عدلِ جنابِ امیر کا
سو جائے آگ کر کے بچھانا حریر کا

پہلے اس شعر کو نظری کر دیا تھا۔ پھر پہلے مصرعے کو اپنی حالت پر باقی رہنے دیا اور دوسرے مصرعے کو یوں بنا دیا۔ 'تھرا کے شمع اوڑھ لے برقع حریر کا'۔

۲۔ شہ کے مدامِ عشق سے آنکھیں چڑھی رہیں
نشہ نہ اترے بادہ خم عذیر کا

اصلاح: نرگس کی بے سبب نہیں آنکھیں چڑھی رہیں
رہتا ہے نشہ بادہ خم عذیر کا

۳۔ رنگ شفق نہیں ہے یہ مینائے چرخ پر
شیشے میں دُرد ہے مئے خم عذیر کا

اصلاح: شیشے میں عکس ہے مے خم عذیر کا

۴۔ لاکر طعام خلد کہا جبرئیل نے
لے اے علیؑ عوض ہے یہ نانِ شعیر کا

اصلاح: کی حق نے ہل اتی میں عطائے علیؑ کی مدح
پایا عوض یہ بخششِ نانِ شعیر کا

اس شعر کو بھی پہلے نظری کر دیا تھا۔ بعد کو بنایا۔

۵۔ کہتے ہیں خضر دامنِ حیدرؓ نہ چھوڑیو
ہے رہ نما وہ شیر جواں مجھ سے پیر کا

اصلاح: پہلے مصرعے کو یونہی رکھا۔ دوسرے کو یوں بنا دیا:
رہبر ازل سے ہے وہ جواں مجھ سے پیر کا

۶۔ اللہ رے لطف و رحم جنابِ امیرؓ کا
کاسہ دیا کریم نے قاتل کو شیر کا

اصلاح: اس مطلع کو شعر کر دیا اور چونکہ شعر بینیہ ہو گیا تھا لہٰذا ترتیب سلام کے اصول کے مطابق اس شعر کو سب سے آخر میں صرف مقطعے کے پیشتر جگہ دی۔ ایک بات قابلِ لحاظ یہ بھی ہے کہ اُنس کے پورے سلام میں صرف مدحیہ شعر تھے۔ بینیہ شعر کوئی نہ تھا، اس لیے ضرورت تھی کہ کم سے کم آخر میں ایک بینیہ شعر رکھ کر نظم کو غزل سے ممتاز کر کے سلام کے دائرے میں لے آئیں۔ شعر بعد اصلاح یوں بنا۔

حیدرؓ کے لطف و رحم پہ رونے لگے حسنؑ
کاسہ دیا علی نے جو قاتل کو شیر کا

پھر 'علی نے جو' کاٹ کر 'جو شیر نے' بنا دیا۔

ایک مطلع اور ایک مقطع خود کہہ کر سلام میں شامل کر دیا جو ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

مطلع: لکھتا ہوں وصف جلوہ صبح غدیر کا
بین السطور جوش ہے دریائے شیر کا

مقطع: اے انس ہر طرف سے نہ کیوں دل غنی رہے
میں بھی تو ہوں فقیر جنابِ امیرؓ کا

ایک شعر اور بھی بڑھا دیا تھا مگر پھر اس کو قلم زد کر دیا۔ وہ شعر یہ ہے۔

اب رہ گئی ہے قدر سخن کی بہ قدرِ جو
حاصل ہوا ہے شعر کو رتبہ شعیر کا

میر انس کے مندرجہ ذیل شعر نظری کر دیے ہیں:

۱۔ رنگیں ہے باغ مدح جنابِ امیر کا پھولوں سے ہے بھرا ہوا دامن فقیر کا

۲۔ ہے تاجِ عرش نام جنابِ امیرؑ کا
شمشیر مہر کی ہے عصا چرخ پیر کا

۳۔ مشکل ہے کیا صراط سے جانا فقیر کا
دامن ہے مستقیم مرے دستگیر کا

۴۔ صرصر ہے باد پاشبہ گردوں سریر کا
بجلی ہے عکس تیغِ جنابِ امیرؑ کا

۵۔ لکھتا ہوں وصف زلف جنابِ امیر کا
خامہ دھواں ہے عنبر و مشک و عبیر کا

۶۔ پھینکا زمیں پہ چیر کے اژدر کو مہد سے
طفلی میں تھا یہ کھیل جنابِ امیرؑ کا

۷۔ بھوکے رہے علیؑ ولی تین دن مگر
پورا کیا سوال یتیم و اسیر کا

۸۔ سرگرمِ عدل ہو جو وہ مختارِ سرد و گرم
چڑھ جائے سر پہ شمع کے طرّہ حریر کا

ڈاکٹر سید قمقام حسین جعفری

نقادانِ انیس

[زیرِ نظر مضمون ڈاکٹر سید قمقام حسین جعفری نے اپنے مضامین کے مجموعے، آثارِ انیس، مطبوعہ ایجوکیشنل پریس، کراچی، (۱۹۷۴) میں شامل کیا تھا۔ یہ پیر محمد ابراہیم ٹرسٹ کراچی، کی پیش کش تھی۔ اس مضمون کو لفظ بلفظ اس لیے شائع کیا جا رہا ہے کہ اس میں کچھ ایسے اقتباسات ملتے ہیں جو اب آسانی سے مطالعے میں نہیں آتے نیز خود مضمون کے بارے میں نسیم امروہوی، کا خیال تھا کہ: "....میرا خیال ہے کہ اس کا بغور مطالعہ انیس کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں خضرِ راہ ثابت ہوگا"۔ اس کی دوبارہ اشاعت اس لیے بھی ضروری محسوس ہوتی ہے کہ میرے خیال میں ہندوستان میں شائقینِ انیس میں سے بہت کم حضرات کو اس کے مطالعے کا موقع مل سکا ہوگا۔ (مرتب)]

☆ تنقید ایک فن ہے لیکن نہایت مشکل۔ نقاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ فن تنقید کے اصولوں سے واقف ہو۔ اس کا مطالعہ وسیع ہونا چاہیے۔ اپنی زبان کے شاہکاروں کا اسے علم ہو اور نکتہ فہم بھی ہونا چاہیے۔

اردو زبان میں فنِ تنقید انگریزی زبان کے فنِ تنقید کا رہینِ منت ہے۔ حالانکہ یہ صریحی بات ہے کہ مغربی تنقید نگاری کے اصولوں سے مشرقی شاعری کو نہیں پرکھا جا سکتا۔ جس طرح مغربی زبان کی اقسامِ نظم سے (ہماری اقسامِ نظم) موافقت نہیں رکھتیں اسی طرح تنقیدی اصول دونوں کے ایک دوسرے سے موافق نہیں ہو سکتے۔ اس بدیہی فرق کے باوجود بعض اہل قلم نے مرثیے کے جائزے میں سختی کے ساتھ مغربی اصول مدِ نظر رکھے ہیں۔ ہر شخص واقف ہے کہ مرثیہ گوئی خالص مشرقی چیز ہے۔ فارسی مرثیہ گوئی سے قطع نظر کیوں کہ اس کا تعلق ایران سے ہے۔ اردو میں اس کا آغاز دکن سے ہوا جس نے شمالی ہند آنے کے بعد ترقی کے مدارج طے کئے اور میر خلیق و ضمیر اور میر انیس و دبیر نے اس کو وہ تنوع بخشا کہ آج اس کی ہیئت قدیم دکنی مرثیوں سے قطعی مختلف نظر آتی ہے۔ مرثیہ کے محاسن سے لطف اندوز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ زاویۂ نگاہ درست کیا جائے اور ذوقِ سلیم کو خضرِ طریقت بنایا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ "سالک" کہیں

مقامات، میں کھو نہ جائے۔

اہلِ ادب واقف ہیں کہ اردو میں تنقید کا آغاز محمد حسین آزاد کے قلم سے ہوا۔لیکن اس بنیاد پر رفیع الشان عمارت حالی نے استوار کی" پرانی تنقید جو محذوف و مقصور کے جھگڑوں، زبان و محاورات کی صحت، اساد کی ہنگامہ آرائی تک محدود تھی، حالی نے سب سے پہلے جزئیات سے قطع نظر کی اور بنیادی اصول پر غور و فکر کیا۔شعر و شاعری کی ماہیت پر کچھ روشنی ڈالی اور مغربی خیالات سے استفادہ کیا۔اپنے زمانے، اپنے ماحول، اپنے حدود میں حالی نے جو کچھ کیا وہ بہت تعریف کی بات ہے۔وہ اردو تنقید کے بانی بھی اور اردو کے بہترین نقاد بھی ہیں۔" [۱]

انیسویں صدی کے وسط تک اردو کے جو تذکرے لکھے گئے وہ فارسی زبان میں تھے۔اردو زبان میں سب سے پہلے انیس پر تنقید آزاد کے مشہور تذکرے" آبِ حیات" میں ملتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اس وقت (۱۸۸۰ء) تک انیس برصغیر میں کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔

"میر انیس صاحب صفائی کلام، لطف زبان، چاشنی، محاورہ، خوبی بندش، حسن اسلوب، مناسبت مقام، طرز ادا اور سلسلہ کی ترتیب میں جواب نہیں رکھتے اور یہی رعایتیں ان کی کم گوئی کا سبب تھیں۔" [۲]

مولانا آزاد کی تنقید کے آخری ٹکڑے سے اختلاف کی کافی گنجائش ہے یہ صداقت پر مبنی نہیں کہ" یہی رعایتیں ان کی کم گوئی کا سبب تھیں" درحقیقت ان پر کم گوئی کا الزام ہی بے بنیاد ہے۔مشہور ہے کہ انیس مرحوم نے دو لاکھ سے زائد اشعار کہے ہیں ان کے کچھ مرثیے ایسے بھی ہیں جو اب تک زیور طباعت سے آراستہ نہ ہو سکے۔

حالی نے مرثیہ اور میر انیس پر جو تنقید کی ملاحظہ فرمائیے اس کے الفاظ یہ ہیں،

---

۱ کلیم الدین احمد" اردو تنقید پر ایک نظر" ، بار اول، مطبع نامی پریس لاہور ناشر عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، جون، ۱۹۶۵ء، ص ۸۷

۲ آزاد محمد حسین" آبِ حیات" مطبوعہ نول کشور پریس پرنٹنگ ورکس لاہور ۱۹۵۷ء صفحہ ۵۱۷۔

''میر انیسؔ نے کہ باوجود خداداد مناسبت چار پشت سے شاعری اور مرثیہ گوئی کی ان کے خاندان میں چلی آتی تھی اس پر اردو زبان کے مالک تھے، اور لکھنؤ بنا ہوا تھا، اس طرز کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔ اردو شاعری میں جو کہ ماء راکد کی طرح مدت سے بے حس و حرکت پڑی تھی تموج بلکہ تلاطم پیدا کر دیا۔'' [۱]

یہ دو اقتباس تو ان حضرات کے تھے جنھوں نے بالاستیعاب اور بہ نظر تنقید دیکھا ہے۔ اب ایک ایسے ادیب کی رائے سنیے جسے اس میدان کا مرد نہیں کہہ سکتے ہمارا مطلب غالبؔ سے ہے۔ غالبؔ نے اپنے زمانے کے لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر اظہارِ خیال کیا ہے۔

انھوں نے مجتہد العصر سید محمد صاحب کی فرمائش پر مرثیے کے تین بند ان کی خدمت میں روانہ کر دیئے اور لکھ دیا کہ:

''یہ تین بند صرف امتثال امر کے لیے لکھے ہیں ورنہ میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں یہ ان لوگوں کا حصہ ہے جنھوں نے اس وادی میں عمریں بسر کی ہیں مجھ کو ان کے درجے تک پہنچنے کے لیے ایک دوسری عمر درکار ہے پس مجھے اس خدمت سے معذور و معاف رکھا جائے'' انکا قول تھا کہ ہندوستان میں انیس اور دبیر جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا۔ [۲]

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ کے تاثرات بھی انیسؔ کی مرثیہ گوئی کے بارے میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں:

''شمس العلماء حالیؔ مرحوم کہ عرصہ تک ان کی (شیفتہؔ) مصاحبت میں تھے بیان کرتے تھے کہ ایک روز ان کی صحبت میں میر انیسؔ کے مرثیہ کا ذکر آ گیا وہ فرمانے لگے یوں تو وہ چار جلدوں کے مالک ہیں اور ان کے کلام کی داد نہیں دی جا سکتی۔ مگر یہ بھی نہ ہوتیں تو ان کا صرف یہ مصرعہ حق مرثیہ گوئی ادا کرنے کو کافی ہے۔ اس وقت کی تصویر کھینچی گئی ہے جب امام حسین علیہ السلام بے مونس و غم خوار میدان کربلا میں رہ گئے تھے۔''

آج شبیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے'' [۳]

---

۱ حالیؔ، خواجہ الطاف حسین، ''مقدمہ شعر و شاعری'' ناشر اردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی باب الاسلام پرنٹنگ پریس کراچی، ۱۹۶۸ء، ص ۲۰۰

۲ حالی، ''یادگارِ غالب'' مطبوعہ لاہور۔ ص ۱۰۱

۳ عرشی، ضمیر الدین، ''حیات مومن'' مطبوعہ دہلی، ۱۳۴۷ھ م ۱۹۲۸ء، ص ۶۷

مولانا شبلی جنھوں نے موازنہ انیس و دبیر لکھ کر ادبی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ میر انیس کی بابت یوں رقم طراز ہیں:۔

"میر انیس کے مرثیوں میں واقعات اور کیفیات کی تصویر کھینچ دینے کی جو خصوصیت ہے دادا کی میراث ہے۔...............

میر انیس نے واقعہ نگاری اور مصوری کے ساتھ بندش کی اور خواص کی طرزِ گفتگو کی خصوصیت بھی قائم رکھی اور یہ قادر الکلامی کی انتہا ہے۔" [۱]

مولانا شبلی نے انیس کی شاعری کی خصوصیات پر نہایت تفصیل سے بحث کی اور ان کے مرثیوں سے انتخاب بھی نہایت خوش اسلوبی سے کیا۔

آتش نے کن الفاظ میں میر انیس کی مرثیہ گوئی کو سراہا اس واقعہ کو امیر احمد علوی کی زبان سے سنیئے:۔

"زوجہ میر ضمیر مرحوم کی چہلم کی مجلس میر انیس نے پڑھی تھی جس میں خواجہ حیدر علی آتش بھی موجود تھے۔ میر صاحب وہ مرثیہ پڑھ رہے تھے جس کا مطلع ہے:

"آمد ہے کربلا کے نیستان میں شیر کی"

تلوار کی تعریف کے سلسلے میں جب یہ بیت آئی: اشراف کا بناؤ رئیسوں کی آن ہے
شاہوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان ہے

اس وقت میر صاحب نے آتش کی جانب مخاطب ہو کر فرمایا کہ:

'اس بیت کی داد آپ سے چاہتا ہوں'

خواجہ صاحب پہلے سے جھوم رہے تھے یہ بیت سن کر نصف قد کھڑے ہو گئے۔ اور بہ آواز بلند کہا" کہ کون بے وقوف کہتا ہے کہ تم محض مرثیہ گو ہو واللہ ثم باللہ تم شاعر ہو اور شاعری کا مقدس تاج تمہارے سر کے لیے موزوں ہے اللہ مبارک کرے"۔ [۲]

میر انیس نے ایک مجلس واجد علی شاہ کے ارشاد کے مطابق پڑھی جب وہ زیب منبر ہوئے تو وہ سلام پڑھا جس کا مطلع ہے: غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہو کر
مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہو کر

۱۔ شبلی، مولانا، "موازنہ انیس و دبیر" بار اول مطبوعہ لاہور، ص ۲۸۔۲۹

۲۔ امیر احمد علوی، "یادگار انیس" مطبوعہ سرفراز پریس لکھنؤ ۱۹۵۷، ص ۳

سلام کے بعد مرثیہ پڑھا واجد علی شاہ نے دل کھول کر تعریف کی اور بعد مجلس فرمایا:۔

"کیوں فتح الدولہ میں نہ کہتا تھا کہ میر انیس لکھنؤ میں ایک ہی شاعر ہیں دیکھا تم نے یہ زبان انھیں کے لیے خاص ہے۔" [۱]

یہاں مختصر الفاظ میں یہ کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ناقدین انیس کی آرا کی ترتیب میں اگر چہ موضوع کو مدنظر رکھا گیا ہے لیکن "لچک" کے ساتھ کہیں کہیں حسب ضرورت نقادوں کی تنقید سے اتفاق یا اختلاف بھی کیا گیا ہے، باایں ہمہ یہ کوشش کی گئی ہے کہ انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔

مصوری، منظر نگاری، جذبات نگاری اور رزمیہ شاعری کے بارے میں انیس کے مرثیوں سے نہایت اختصار کے ساتھ کچھ بند نقل کر دیتے ہیں تاکہ ناقدین کے مفہوم کی پوری طرح وضاحت ہو سکے۔

"انھوں (انیس) نے مرثیے کے محدود چوکھٹے میں جو تصویریں سجائی ہیں، جو رنگ آمیزی کی ہے اور صناعی کا جو کمال دکھایا ہے وہ براہ راست محض رونے رلانے کے لیے نہیں ہو سکتا یقیناً ان کے اندر وہ شاعرانہ اور خلاّقانہ بصیرت تھی جو کسی صنف کی رسمی اور میکانکی حدوں کی پابند نہیں ہوتی بلکہ اپنے مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس کے دائرے کو وسیع کرتی ہے۔" [۲]

"میر انیس کا سب سے بڑا کمال ان کی مصوری یا واقعہ نگاری ہے۔ وہ انسانی کردار افعال چاہے وہ ساکن ہوں یا متحرک میدان جنگ کا نقشہ اور بزم کی گرماگرمی کی اس قدر صحیح تصویر اتار دیتے کہ بڑے سے بڑا مصور بھی اس پر حرف گیری نہیں کر سکتا مثال کے طور پر ایک بند ملاحظہ ہو۔ کربلا سے دمشق کے راستے میں میر انیس حضرت امام زین العابدین کی حالت کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:۔

حلقے میں دل گدازوں کے وہ یوسف ثانی تلواریں لیے چاروں طرف ظلم کے بانی
وہ طوق کا لنگر وہ سلاسل کی روانی غربت کا الم، بے پدری، تشنہ دہانی
مڑ کر کبھی زینب کے رخ پاک کو دیکھا
بیڑی کبھی دیکھی کبھی افلاک کو دیکھا" [۳]

---

[۱] میر احمد علوی، "یادگار انیس" مطبوعہ سرفراز پریس لکھنؤ ۱۹۵۷ء ص ۳

[۲] احتشام حسین، سید "مراثی انیس" جلد اول، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۹ء، (مقدمہ) ص ا

[۳] محمد دفاروقی "میر حسن اور ان کے خاندان کے دوسرے شعراء" مطبوعہ راولپنڈی۔ ناشر پنجاب اینڈ فرنٹیر بک ڈپو، راولپنڈی، ص ۲۹۵

"میر انیسؔ کی مرثیہ گوئی میں اس کی (یعنی منظر نگاری کی) بڑی اہمیت ہے یہ مرثیہ کا وہ جزو ہے جس میں میر انیسؔ صرف اپنے ہم عصروں ہی میں بہت بلند نظر نہیں آتے بلکہ انیسؔ کے بعد آنے والوں میں بھی کوئی ایسا نہیں ہوا جو انیسؔ کی منزل تک پہنچا ہو۔

منظر نگاری میں انھوں نے کسی سماں کو نہیں چھوڑا ہے.............

انیسؔ کی منظر نگاری کبھی کبھی مرقع کشی ہو گئی ہے اور شاعر کے قلم اور مصور کے موقلم میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح گلزار شب خزاں ہوئی آئی بہار صبح
کرنے لگا فلک زر انجم نثارِ صبح سرگرم ذکر حق ہوئے طاعت گزارِ صبح
تھا چرخ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا[1]

"میر انیسؔ کی منظر نگاری کے سلسلے میں مختصراً اگر یہ کہا جائے کہ ان کا ہر شعر ہر مصرع اور حتیٰ کہ ہر لفظ ایک واضح صورت رکھتا ہے تو یہ غلط نہ ہوگا پھر بھی امام حسینؑ کے نام لیوا کی وہ تصویریں نہایت اہم اور وقیع ہیں جن کا براہ راست سبطِ نبیؐ کے کسی مقدس عمل سے تعلق ہے۔ مصورِ غم کے مرقعِ غم سے میں ایک آخری تصویر اور پیش کروں گا یہ منظر ہم شکل مصطفیٰ[2] کی شہادت کا منظر ہے اور ظاہر ہے کہ میر انیسؔ نے اس تصویر میں خونِ جگر کا رنگ بھرا ہوگا:۔

تھا عصر کا ہنگام کہ حضرت کو غش آیا!! سجدے میں سنبھل کر سرِ اقدس کو جھکایا
خنجر کو لعیں حلق کے نزدیک جو لایا زہرا کی صدا آئی کہ ہے ہے مرا جایا
قاتل کو تو کچھ منہ سے نہ فرماتی تھی زہرا
فرزند سے ہر بار لپٹ جاتی تھی زہرا[3]

"انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے مرثیہ کے ہر جزو کو پوری پوری تاب و تواں بخشی ہے لیکن انیسؔ کا کمال ان جملہ عناصر مرثیہ ہی کے پیش کرنے پر موقوف نہیں بلکہ دراصل ان میں

---

[1] سفارش حسین رضوی "اردو مرثیہ، تاریخ مرثیہ" مطبوعہ دہلی، جولائی ۱۹۶۵ء ص ۳۲۰

[2] ہم شکل مصطفیٰ کی نہیں بلکہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا منظر ہے (ق۔ ح۔ جعفری)

[3] ارشار صدیقی "میر انیس کی منظر نگاری کے چند نادر نمونے" مطبوعہ روزنامہ "حریت" کراچی، عاشورہ ایڈیشن، ۹ مارچ ۱۹۷۱ء ص ۱۱

میں ہے چنانچہ جس چیز کا وہ تذکرہ کرتے ہیں اس کی ہو بہو تصویر کھینچ دی جائے جو مصور کے موئے قلم کی دسترس سے بھی باہر ہو۔'' [۱]

''انیسؔ کا مطالعہ زبان میں لوچ، شستگی، حسن دیانت کا سبب ہے۔ اس سے مشاہدے کی قوت میں وسعت و گہرائی حاصل ہوتی ہے۔ نفسیات کے نکتے اجاگر ہوتے ہیں۔ احساسات میں توازن و جوش آتا ہے۔ اسلامی تاریخ سے ربط اور مجاہدۂ کربلا کے لیے بصیرت، عکاسی، تصویر کشی کے ماہرانہ خطوط، ثقافت اور تاریخ کے واضح مجسمے، تخیل و شاعری کے مثالی ارتقاء کو سمجھنے کے لیے مراثی انیسؔ کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ [۲]

''انیسؔ کا کام فقط یہی نہیں کہ ہمیں اپنی طبع حساس کی نزاکتوں سے کام لے کر آہ و بکا پر آمادہ کرے بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اظہار کو شعری ابلاغ کی حسین ترین صورت دے۔ اردو میں فطری مناظر کی تصویر کشی اتنی کم ہے کہ انیسؔ کے کلام میں سے ایسے بندوں کا انتخاب نہ کرنا انیسؔ پر اور اردو شاعری پر ظلم ہے۔ انیسؔ اس معاملے میں اردو شعر کی آبرو ہیں انھوں نے ایسی نزاکت و نفاست سے مناظر کی تصویریں کھینچی ہیں کہ مصور کا موقلم ان کے آگے سربسجدہ ہے۔'' [۳]

''میں سمجھتا ہوں کہ میر انیسؔ کی شاعری کو دہلی یا لکھنؤ اسکول سے منسوب کرنا غلطی ہے کیونکہ انیسؔ کو زبان دانی کی وجہ سے کامیابی نہیں ہوئی بلکہ زیادہ تر اس لیے کہ وہ شاعر سے زیادہ کچھ اور بھی تھے اور اس سے کم تر درجہ کا فن کار کبھی یہ مرتبہ حاصل نہ کر سکتا تھا خواہ وہ لکھنؤ کا ہوتا یا دہلی کا۔'' [۴]

ڈاکٹر صاحب کے نقطۂ نظر سے انیسؔ مرحوم ایک فن کار تھے جنھوں نے واقعات کی مرقع کشی بھی فرمائی اور ماہر نفسیات کی حیثیت سے جذبات نگاری کے اعلیٰ نمونے مرثیوں میں پیش کیے۔

۱۔ افضال حسین، سید، مضمون ''مرثیہ اور انیسؔ''، مطبوعہ ''نقوش'' شمارہ بابت دسمبر ۱۹۷۰ء، ص ۱۷۷

۲۔ فاضل، مولانا سید مرتضیٰ حسین، ''مقدمہ'' ''فکر انیسؔ'' منظور علی علوی، بار سوم مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۱۹۔

۳۔ عابد، سید عابد علی، ''مقدمہ ثانی فکر انیسؔ'' ص ۳۰۔۳۱

۴۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر ''اردو مرثیہ اور میر انیسؔ'' مطبوعہ رسالہ ''نگار'' (اصناف شاعری نمبر) کراچی، سالنامہ، ۱۹۶۷ء، ص ۱۹۸۔

"انھوں نے اردو مرثیے میں انسانی نفسیات کو اس طرح سمویا ہے کہ پتھر دل انسان بھی کربلا کے اندوہناک المیہ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کربلا کا المیہ مذہب وعقیدت سے ہٹ کر بھی انسانی کردار و اخلاق کا ایک ایسا سانحہ ہے۔ جس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ میر انیسؔ نے اس خون آشام ٹریجڈی کو جذبات نگاری کا جو روپ دیا ہے وہ اردو شعر و ادب کے انمٹ نقوش ہیں جنھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔"

انیسؔ کی شاعری میں مصوری اور جذبات نگاری کے نمونے:

مصور کا کمال یہ ہے کہ وہ ایسی تصویر بنا دے جو ہو بہو اصل کے مطابق ہو لیکن میر صاحب نے تصویر میں ایسے رنگ بھر دیئے کہ وہ اصل سے بڑھ گئی ان کی دعا مستجاب ہوئی کہ:

قلم فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ
شمع تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ

میر صاحب کی مصوری کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں:

حضرت حبیب بن مظاہر سن رسیدہ بزرگ تھے یوم عاشورہ آپ امام حسینؑ کی رکاب میں پیدل تھے۔ انیسؔ کے معجز نما قلم کی "مرقع کشی" کی داد دیجئے۔

ابرو جھکے جو پڑتے تھے آنکھوں پہ بار بار　　رومال پھاڑ کر انھیں باندھا تھا استوار
آنکھوں سے شیرِ نر کی جلالت تھی آشکار　　گویا کہ تھی غلاف میں حیدر کی ذوالفقار
جلدی چلے جو چند قدم جھوم جھوم کے
رعشہ وداع ہو گیا ہاتھوں کو چوم کے

بیت کی جس قدر تعریف کی جائے وہ کم ہے 'سحر حلال' کی نادر مثال ہے۔ 'رعشہ وداع ہو گیا ہاتھوں کو چوم کے' بار بار اس مصرع کو پڑھیے لطف اندوز ہونے کی کوشش کیجئے۔ انیسؔ کے کمال شاعری میں جو شک لائے وہ کور ذوق تو ضرور کہا جائے گا۔

منظر کشی

انیسؔ کا جادو نگار قلم کیسے کیسے مناظر ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔

عاشورہ کی صبح کا منظر:

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دمبدم　　مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب وتابِ نہر وہ موجوں کا پیچ وخم　　سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

تشبیہ کی خوبی ہے معنی آفرینی۔ تشبیہ کی جدت سے کلام میں چار چاند لگ جاتے ہیں ایسی تشبیہ کی مثال شاید ہی دوسری زبانوں میں مل سکے۔ اور اس کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ میر صاحب کا کلام گوہر محیط فصاحت ہے اور ان کے دامن میں وہ گل ہیں جن پر ان سے پہلے کسی کو دسترس حاصل نہیں ہو سکی۔ حضرت امام حسین علیہ السلام اپنی آخری قربانی کو ہاتھوں پر رکھ کر میدانِ کارزار میں قدم رنجہ فرماتے ہیں اس موقع کی مرقع کشی کس غضب کی ہے:

بچے کو لیے گھر سے جو نکلے شہِ والا　　تھی دھوپ میں تیزی کہ ہرن ہوتا تھا کالا
نکلا تھا کبھی گھر سے نہ وہ ہنسلیوں والا　　دامانِ عبا چہرہ فرزند پہ ڈالا
روتا تھا تو چھاتی سے لگا لیتے تھے شبیرؑ
ہر گام پہ دامن کی ہوا دیتے تھے شبیرؑ

جزئیات کی تفصیل کی وجہ سے مرقع کشی اور جذبات نگاری کا حسین امتزاج سہل ممتنع تعریف و توصیف سے بالاتر ہے۔

مظلوم امام کا کلام سن کر پتھر کے دل بھی پسیج گئے اور یہ حال ہو گیا۔

کی آہ کسی نے کوئی منہ پھیر کے رویا　　دامن کسی جلاد نے اشکوں سے بھگویا
ہر شخص کے اک تیر لگا قلب پہ گویا　　بولا کوئی ایماں بھی گیا دین بھی کھویا
یوں پھول کوئی دھوپ میں مرجھا نہیں جاتا
بچے کا یہ عالم ہے کہ دیکھا نہیں جاتا

حضرت علی اصغر حرملہ کے تیر سہ پیکر سے شہید ہوتے ہیں یہ سب سے کم سن مجاہد تھے

ننھی سی قبر کھود کے اصغر کو گاڑ کے
شبیرؑ اٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے

مرقع کشی اور جذبات نگاری نے انیس کے کلام کو کس قدر عروج بخشا۔ جذبات نگاری کے بہت سے نمونے انیس کے ہر مرثیے میں ملیں گے۔ حضرت علی اصغر کے بارے میں ایک بند اور نقل کیا جاتا ہے جس سے یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ میر صاحب کی داخلی شاعری ان کی شہرت کی کس حد تک ضامن ہے۔

حضرت امام حسینؑ فوج یزید سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ پانی مجھے لا دو　　　خود تم ہی اسے آن کے چلو میں پلا دو
مرتا ہے یہ مرتے ہوئے بچے کو جلا دو　　　للہ کلیجے کی مرے آگ بجھا دو

جب منہ مرا تکتا ہے یہ حسرت کی نظر سے
اے ظالمو اٹھتا ہے دھواں میرے جگر سے

منظر کشی اور جذبات نگاری میں انیس کو ید طولیٰ حاصل تھا جب وہ بزم، چھوڑ کر رزم کا بیان فرماتے تو ان کی طبع اولوالعزم خیبر کی خبر لاتی اور تلوار پر تلوار چمکتی نظر آتی جس کی جھنکار سامع و قاری کو بھی سنائی دیتی ہے۔

انیس کی رزمیہ شاعری:

انیس کی رزمیہ شاعری کے بارے میں نقادانِ سخن کے جواہر پارے ملاحظہ فرمائیے:

"میری دانست میں ہومر ایک بڑا رزمی شاعر تھا لیکن اگر ہومر سیر تھا تو میر صاحب سوا سیر تھے۔ اس افزونی کی وجہ یہ تھی کہ میر صاحب خود نفس شاعری میں ہومر سے زیادہ تھے یا یہ کہ میر صاحب کو سبجیکٹ (subject) یعنی شاعری کا موضوع ایک ایسا واقعہ بزرگ ہاتھ لگا کہ جس کا جواب دنیا میں نظر نہیں آتا ہے۔" [1]

"انیس کا مرثیہ حقیقت میں ایک خاص طرح کی رزمیہ نظم ہے جس کی ترکیب میں مرثیت کا عنصر لازمی طور پر موجود رہتا ہے اس نظم کا میدان مرثیے سے کہیں زیادہ وسیع ہے بلکہ معنوی حیثیت سے شعر کی جتنی قسمیں کی جاسکتی ہیں یہ ان سب پر حاوی ہے۔" [2]

---

[1] اثر، امداد امام "کاشف الحقائق (معروف بہ بہارستانِ سخن)"مطبوعہ لاہور، جلد دوم، ص ۴۷۲

[2] مسعود حسن رضوی، پروفیسر سید، "روحِ انیس" مطبوعہ الہ آباد، ص ۵۱

"اردو ادب میں انیسؔ کے رزمیہ مرثیوں کا جو مقام ہے اس کا تقابل کسی شاعر کے کلام سے کرنا کلامِ انیسؔ کی توہین ہے حالانکہ ان مرثیوں کے ساتھ ظلم یہ ہوا کہ انھیں صرف مذہبی نظم سمجھ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔" [1]

"میر انیسؔ کے کلام میں رزمیہ شاعری کی جملہ خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ انھوں نے اس صنف کلام کو وہ بلند درجہ دیا جہاں تک شاید ارسطو کا تصور بھی نہ پہنچ سکا تھا۔ وہ یقینی طور پر ارسطو کی شعریات (Poetics) سے بالکل نا آشنا تھے بلکہ شاید اس کا نام بھی انھوں نے نہ سنا ہوگا لیکن تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کے باوجود ان کا سارا کلام رزمیہ کے اصول و قواعد سے آراستہ ہے جو باتیں ارسطو نے آج سے پہلے کئی ہزار برس رزمیہ شاعری کو پیش نظر رکھ کر ایپک کے لیے ضروری سمجھی تھیں وہ سب کی سب میر انیسؔ کے کلام میں موجود ہیں۔ انھوں نے زیادہ سے زیادہ فردوسی کے شاہنامہ اور مہابھارت اور رامائن کا مطالعہ کیا ہوگا لیکن اس پر کمال یہ ہے کہ انھوں نے بحیثیت رزم نگار شاعر کے دوسرے رزمیہ شاعروں کی محفل میں ایک بلند درجہ حاصل کیا۔" [2]

رزمیہ شاعری دراصل واقعہ نگاری کی ایک قسم ہے لیکن خالص رزمیہ مقامات کے بیان میں فکر کو حقیقت کی سطح سے بلند و ارفع کرنا چاہیے۔ ملحوظ خاطر رہے کہ مبالغہ میں آمد، ندرت اور خلوص فکر ہو، زور بھی ہو اور معنویت بھی تاکہ مبالغہ پر حقیقت کا دھوکا ہونے لگے۔ اعتقادی ادب میں تو اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ رزم ایسی ہے کہ سب کے دل بھڑک جاتے ہیں اور تیغوں کی بجلیاں آنکھوں میں چمک جاتی ہیں رزمیہ شاعری کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی جنگ کی ایک جھلک:

نکلی جو رن میں تیغ حسینی غلاف سے　　اڑنے لگے شرر دمِ خارا شگاف سے
بجلی بڑھی چمک کے جو دشتِ مصاف سے　　صاف آئی الاماں کی صدا کوہِ قاف سے
طبقے فلک کے صورتِ گہوارہ ہل گئے
دب کر پہاڑ خاک کے دامن سے مل گئے

---

[1] آہ، صفدر "فردوسی ہند" بمبئی، ناشر کتاب کدہ بمبئی ۱۹۵۸، ص ۱۰۹

[2] اکبر حیدری، ڈاکٹر، میر انیسؔ بحیثیت رزمیہ شاعر" مطبوعہ: سرفراز قومی پریس لکھنؤ ناشر "ادبستان" سری نگر کشمیر، ۱۹۶۱ء ص ۴۵

کالے علم، نشان سیہ کالی سب سپاہ گویا زمیں کے سینے سے اٹھتا تھا دودِ آہ
تھا نالۂ نفیر کہ بیکس کو دو پناہ شہنائی یہ صدا تھی کہ سید ہے بے گناہ
سن کر دُہل کا شور کلیجے دہلتے تھے
تھرا کے جھانجھ بھی کفِ افسوس ملتے تھے

گرتی تھی ذوالفقار جو سن سن ادھر اُدھر دہشت سے چھپتے پھرتے تھے دشمن ادھر اُدھر
کٹ کٹ کے گر رہے تھے سر و تن ادھر اُدھر ٹکڑے پڑے تھے خاک پہ جوشن ادھر اُدھر
ڈر ڈر کے جو سوار گرے وہ مرے گرے
صف پر گری جو صف تو پروں پر پرے گرے

رزمیہ شاعری میں ہیرو کی تلوار کی تعریف کی جاتی ہے اس کے محاسن بتائے جاتے ہیں۔ انیس نے تشبیہات کی مدد سے تلوار کی جی کھول کر تعریف کی۔

آفت تھی، قہر تھی، غضب ذوالجلال تھی بجلی تھی، صاعقہ تھی، فنا تھی، زوال تھی
خنجر تھی، نیمچہ تھی، کٹاری تھی، ڈھال تھی اعدا کے ذبح کرنے کو سحرِ حلال تھی
جیتا تو سامنے سے کوئی کم نکل گیا
منہ اس کا جس نے دیکھ لیا دم نکل گیا

ایک بند اور ایک بیت رہوار کی تعریف میں سن لیجئے رزمیہ شاعری کا ایک جزو ہیرو کا رہوار بھی - ہوتا ہے:

صرصر تھا گاہ گاہ نسیم سحری تھا طاؤس فلک سیر دمِ جلوہ گری تھا
بن بن کے اٹھانے میں قدم کبک دری تھا کاوے میں جو پرکار تو اڑنے میں پری تھا
رفتار تو کیا اپنی دکھاتا تھا کسی کو
سایہ بھی نہ اس کا نظر آتا تھا کسی کو

بیت ملاحظہ ہو:

راکب نے سانس لی تو وہ کوسوں روانہ تھا تارِ نفس بھی اس کے لیے تازیانہ تھا

نہ رہوار کی سرعت اور تیزی کی انتہا ہے اور نہ انیس مرحوم کی جولانی طبع کا جواب ہے۔
رزمیہ شاعری نے اردو زبان کو لفظاً اور معناً دونوں حیثیتوں سے مالا مال کیا۔ انیس کی رزمیہ

شاعری پر جس قدر فخر کیا جائے وہ کم ہے۔ نوجوانوں کے اخلاق کی تربیت ان میں جوش و ولولہ اور قومی و ملکی جذبہ پیدا کرنے کے لیے رزمیہ شاعری صحیح منزل کی نشاندہی کر سکتی ہے۔

"اردو شاعری کی ابتداء غالباً مراثی سے ہوئی اور میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے زمانے میں اس نے اس قدر وسعت حاصل کی کہ تمام اصناف شاعری کو محیط ہوگئی اس لیے ان میں خالص مرثیت کم پائی جاتی ہے۔" [1]

اس صنف کی داغ بیل دکن میں ڈالی گئی۔ گول کنڈہ کے فرمانروا قلی قطب شاہ نے پانچ مرثیے لکھے جو مختلف بیاضوں میں ملتے ہیں۔ [2] جب مرثیے نے ترقی کی تو اس کے موضوع میں تنوع پیدا ہوا۔ مرثیے میں درد و غم کی باتیں بھی ہوتی ہیں جن کو بین کہا جاتا ہے اور یہی بین مرثیے کا مقصود بھی ہیں۔ بین کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ مرثیہ تمام اصناف شاعری پر محیط ہے۔ اس ضمن میں چند نقادوں کی آراء پیش کی جاتی ہیں:

"ان کا (انیسؔ کا) پاکیزہ کلام بہترین اصناف سخن کا جامع ہے اس میں ڈراما بھی ہے اور ایپک بھی۔ تشبیب و غزل بھی ہے اور رباعی و مسدس بھی۔ واقعہ نگاری بھی ہے اور اظہار جذبات بھی۔ بلاغت کا انداز بھی ہے اور فصاحت بھی۔ استعارات و تشبیہات بھی ہیں اور صنائع و بدائع بھی۔ مناظر قدرت کے فوٹو ہیں اور خیال آفرینی بھی۔ فخر و خودستائی ہے اور عجز و انکسار بھی۔ رزم و بزم ہے اور اصلاح اخلاق بھی۔ محاورہ بندی اور روزمرہ ہے اور توازن و تناسب الفاظ بھی۔" [3]

"کہا جاتا ہے کہ آپ نے (انیسؔ نے) دو لاکھ سے زائد اشعار کہے ہیں اور مرثیہ گوئی میں مسلمہ طور پر سب سے افضل و برتر ہیں قادر الکلامی، فصاحت و بلاغت و ہمہ گیری اظہر من الشمس ہے، واقعہ نگاری، رزم و بزم، رجز، مناظر قدرت غرض کیا ہے جو آپ کے یہاں نہیں ہے۔ سلام و رباعیات بھی بے نظیر ہیں سلام کے بعض اشعار ایسے ہیں جو غزل کی صنف میں بھی داخل ہو سکتے ہیں۔" [4]

۱۔ عبدالسلام ندوی، مولانا "شعر الہند" اعظم گڑھ، ص ۳۵۶

۲۔ قلی قطب شاہ کے مطبوعہ کلیات میں بھی ہیں۔

۳۔ امیر احمد علوی "یادگار انیس" ص ۲۰۱

۴۔ تنہا، محمد یحییٰ، "مراۃ الشعراء" لاہور، عالمگیر الیکٹرک پریس، ۱۹۴۵۔۴۶ء جلد اول ص ۳۴۶

"میر انیس نے تقریباً دو لاکھ اشعار لکھے اور ان کا بہت سا ذخیرہ ادب اب بھی پردۂ خفا میں ہیں۔ لیکن جو کچھ موجود ہے وہ بھی دنیا کی بڑی سے بڑی نظموں کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہے۔ رزمیہ شاعری ہو یا المیہ واقعہ نگاری ہو یا جذبات نگاری۔ مصوری ہو یا مرقع نگاری، فصاحت ہو یا بلاغت، سادگی ہو یا سلاست، لفظی خوبی ہو یا معنوی حسن میر صاحب کو ہر ایک کے استعمال پر قدرت کاملہ حاصل ہے۔ روزمرّہ اور محاورہ کا برمحل استعمال الفاظ وتراکیب کی بہترین نشست روان اور مترنم بحریں ان کے کلام میں چار چاند لگاتی ہیں۔" [1]

"بے شک میر انیس بھی پوری نوع انسانی کے شاعر ہیں لیکن وہ اس منزل تک کربلا کی قتل گاہ سے پہنچے ہیں، انیس کی شاعری میں محبت، شرافت، صداقت، سرفروشی، ایثار حق، رحم ظلم، شقاوت، باطل پرستی اور خود پرستی کے متضاد جذبات ایک خاص واقعہ کے تاثر سے مرتفع یا منتقل ہو کر آئے ہیں اور اس طرح ان کی حیثیت انفرادی سے زیادہ اجتماعی ہوگئی ہے اس لیے تاریخ ساز بھی۔" [2]

اس صنف شاعری کی وجہ سے مسدس نے مقبولیت حاصل کی۔

"انیس و دبیر نے اپنی فن کاری سے یہ ثابت کردیا کہ بیانیہ شاعری کے لیے اس سے بہتر کوئی صنف نہیں ان لوگوں نے مسدس کو ادبی دنیا میں ہمیشہ سے زیادہ وقیع وسربلند کردیا۔" [3]

بیانیہ شاعری کے لیے صنف مثنوی نہایت موزوں تصور کی جاتی ہے لیکن مسدس میں وہی تسلسل پایا جاتا ہے جو مثنوی کے لیے ضروری ہے۔

انیس نے اپنے مرثیہ میں ناقدری [4] عالم کی شکایت ضرور کی تھی لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ وہ ان خوش قسمت شعراء میں سے تھے جن کے کلام کی قرار واقعی قدر ان کی زندگی ہی میں ہوگئی تھی اور ارباب ذوق

---

۱ شجاعت علی سندیلوی "تعارف مرثیہ" ادارہ انیس الہ آباد ص ۷۴

۲ رئیس امروہوی، "انتخاب میر انیس" "پیش گفتار" مئی ۱۹۶۳،

۳ اعجاز حسین، ڈاکٹر سید، "واقعہ کربلا اردو ادب اور دیگر فنون میں" بحوالہ رسالہ "محور" کراچی حسین نمبر، شمارہ ۱۱۔ ۱۲، بابت ۶ رمئی، ۱۹۶۴، ص ۳۲۔

۴ ناقدریٔ عالم کی شکایت نہیں مولا   کچھ دختر باطل کی حقیقت نہیں مولی

ے اشعار سن کر تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کیے۔ اگر ابنائے زمانہ نے انیسؔ کے کلام کی خاطر خواہ
ہ تو اس سے ان کی شاعری پر حرف نہیں آتا۔ اسی مفہوم کو چکبستؔ کی زبانی سنیئے اور ان کی ہر دلعزیزی کی
ت مرزا جعفر علی خاں اثرؔ اور مہذب لکھنوی نے بھی اظہار خیال کیا ہے۔

"اگر آتشؔ و انیسؔ و غالبؔ کی شاعرانہ وقعت کا صحیح اندازہ ہم سے نہ ہو سکا تو ان کی شاعری کا قصور نہ تھا بلکہ اپنی قومی بے خبری کے عالم میں جہاں ہم نے زندگی کے بہت سے معاملات میں مغربی تہذیب کے اکثر اصولوں کی غلط تعبیر کی وہاں انگریزی شاعری کے صحیح اندازے سے ہم نے اپنا مذاق سخن بھی الٹا سیدھا قائم کر لیا۔" [۱]

"مراثی انیسؔ کے بیشتر مقامات تخیل اور محاکات کے لطیف امتزاج کے نادر مرقعے ہیں ان میں واقعات و جذبات مصور ہو گئے ہیں ان میں زندگی کی لہر ہے امنگ ہے دھڑکن ہے۔" [۲]

اسی کتاب میں مرزا صاحب نے انیسؔ کی ہستی پر فخر کیا وہ فرماتے ہیں"
کیا بے جا ہے اگر ہم انیسؔ کو زبان اردو کا محسن اور اس کو دنیا کی بڑی سے بڑی زبان کا ہم پلہ بنا دینے والا مانتے ہیں اور نازاں ہیں کہ ہم میں انیسؔ سا شاعر پیدا ہوا۔" [۳]

"ہم نے جہاں تک غور کیا ہم کو اردو شاعروں میں صرف انیسؔ ہی کی ایک ایسی ذات ملتی ہے جس کو صحیح معنوں میں ہر دلعزیز ہونے کا شرف حاصل ہے بلکہ ہم تو یہاں تک کہنے کو تیار ہیں کہ لفظ ہر دلعزیز اردو شاعروں میں انیسؔ کے علاوہ کسی دوسرے کے ساتھ اپنے محیط و مکمل معنی میں کبھی استعمال ہی نہیں ہوا ہر اردو جاننے والے کی انیسؔ کے مرثیے سے وہی دلچسپی ہے جو کسی زبان دان کو ہوتی ہے۔ عام اس سے کہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو اور یہ بات انیسؔ اور ان کے کلام کی ہر دلعزیزی نہیں تو اور کیا ہے۔" [۴]

۱۔ چکبست، برج نرائن، "مضامین چکبست" انڈین پریس الہ آباد ۱۹۲۸ء ص ۲۶۸

۲۔ اثر، مرزا جعفر علی خاں "انیسؔ کی مرثیہ نگاری اور ان پر چند اعتراضات" ادبی پریس لکھنؤ، ناشر محل لکھنؤ ۱۹۵۱ء ص ۵۰

۳۔ اثر، مرزا جعفر علی خاں بحوالہ بالا، ص ۱۰۳

۴۔ مہذب لکھنوی "وقار انیسؔ" جلد اول، دیباچہ ص ۷

رباعیاتِ میر انیسؔ

انیسؔ کی رباعیوں کے بارے میں ڈاکٹر سلام کے مقالے سے اقتباس پیش کیا جارہا ہے:

"کیف وکم دونوں اعتبار سے میر انیسؔ اردو کے ایک ممتاز رباعی گوشاعر تسلیم کیے جاتے ہیں ان کی رباعیات میں وہی سلاست وروانی، جدت وندرت، فصاحت وبلاغت، تازگی وشگفتگی، نشست الفاظ اور بلندیٔ تخیل موجود ہے جو میر انیسؔ کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔" [۱]

اسی ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمایا کہ:

"میر انیسؔ سے قبل اردو رباعی گوشعراء نے رثائی رباعیات بہت کم کہی ہیں میر انیسؔ کے یہاں یہ رباعیاں ایک خاص موضوع کی حیثیت رکھتی ہیں، میر انیسؔ کا قلم مرثیہ نگاری میں جو لانیاں دکھا چکا تھا اس لیے ان کو رثائی رباعیاں کہنے میں کوئی خاص کاوش نہیں کرنا پڑتی تھی ان کی رثائی رباعیوں میں تقریباً وہی مضامین ہوتے ہیں جو ان کے مرثیوں میں موجود ہیں۔"

رومال ہے اشکوں سے بھگونے کے لیے   یہ راتیں یہ دن نہیں ہیں سونے کے لیے
ہنسنے کے لیے تو سال بھر ہے یارو   دس روز محرم کے ہیں رونے کے لیے [۲]

"انیسؔ اور دبیرؔ نے مرثیہ گوئی میں جتنی کچھ شہرت حاصل کی اس کی مثال متقدمین اور متاخرین میں ملنا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک عرفِ عام میں انھیں مرثیہ گوئی کا امام سمجھا جاتا ہے۔ یہ غلط ہے کیونکہ مرثیہ نگاری انیسؔ اور دبیرؔ سے بہت پہلے ارتقائی منزلیں طے کر چکی تھی فنی حیثیت کا تعین ہو چکا تھا مرثیوں کے اسلوب ایجاد کر لیے گئے تھے۔ انیسؔ نے بھی اپنے متقدمین کی طرح متعدد غلطیاں کیں۔ ان کی سب سے نمایاں اور اہم غلطی کردار نگاری ہے ان کے تمام تر افراد مرثیہ عربی نژاد ہیں اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے ان کے رہن سہن، اور طرز معاشرت میں مقامی تہذیبی رنگ بھرا ہے یہ کردار نگاری کا کمال نہیں بلکہ بہت بڑی بدعت ہے اسے میں اہل بیت کے مرتبے اور وقار کے منافی سمجھتا ہوں۔" [۳]

۱۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر، "اردو رباعیات" ص ۳۶۳

۲۔ " " " ص ۳۶۹۔ ۷۰

۳۔ عروج، عبدالرؤف، اردو مرثیہ کے پانچ سو سال" باراول، مطبع انٹرنیشنل پریس کراچی، ناشر مکتبۂ نیا راہی کراچی ص ۴۰

یہ ملحوظ خاطر رہے کہ مرثیہ ہماری شاعری کی ایک اہم صنف ہے جس کی ایجاد کا سہرا اس برصغیر کے شعراء کے سر ہے۔ مرثیہ میں اردو کا رنگ اور اردو کا مزاج نمایاں ہے۔ مرثیوں کا پس منظر اور ماحول اور کردار عرب ہیں لیکن مرثیہ گو شعراء نے تصرف کر کے اردو کا پس منظر اور ماحول عطا کیا اور کرداروں کو ہمارے معاشرے کے کرداروں سے ہم آہنگ کر دیا تا کہ یگانگت کا عنصر اور تاثر پیدا ہو جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بنیادی تصرف تھا لیکن اس پر اعتراض کرنا ذوق سلیم کو منہ چڑانا ہے۔

اسی ضمن میں ڈاکٹر زور اور مولانا اختر علی تلہری کے بیانات نقل کیے جاتے ہیں

"میر انیس اگر کربلا کے دردانگیز واقعات کی ہو بہو نقل اتار دیتے تو ان کا کلام صرف ایک مذہبی یا تاریخی کتاب کی حیثیت میں منحصر رہتا اور وہ غیر محدود شہرت و عظمت جو آج ان کی شخصیت اور شاعری کی دامنگیر ہے ہرگز نصیب نہ ہوتی [۱]

یہی وجہ تھی کہ انھوں نے عربی طرز معاشرت کی جگہ ہندوستانی طرز معاشرت کے خاکہ میں اپنے عرب رجال داستان کو متحرک کیا اگر انیس اپنے مرثیوں میں عربی طرز معاشرت کی وفاداری کے ساتھ ترجمانی کرتے تو انھیں ہرگز کامیابی اور مقبولیت عام حاصل نہ ہوتی اور نہ صرف یہی بلکہ ادیب کامل اور اعلیٰ صناع ہونے سے بھی محروم رہ جاتے۔" [۲]

"انیس شاعر ہیں اور حقیقی شاعر۔ انھوں نے اردو شاعری کی تصویر میں رنگ بھرنے کے لیے عرب کی تاریخ کا ایک خونچکاں ورق سامنے رکھا ہے۔ وہ خون چکاں ورق جوان کے ایمان کا قیمتی سرمایہ بھی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان کے شاعرانہ تخیلی تصرف نے عرب کی تاریخ اور عرب کے تمدن سے ہر جگہ پر بھیک نہیں مانگی ہے بلکہ بیشتر اپنے اردگرد کی چلتی پھرتی مناسب تصویروں سے مستقل انسانی نقشے حاصل کیے ہیں اس لیے ان کے مرقعوں میں عربی رنگ کے ساتھ ہندوستانی رنگ بھی موجود ہے۔" [۳]

۱۔ زور، سید غلام محی الدین قادری، "تین شاعر یعنی (میر تقی میر، میر انیس اور ہوریس اسمتھ) پر ایک تنقیدی نظر" شمس الاسلام پریس حیدرآباد دکن، ۱۹۲۶ء، ص ۷۶

۲۔ زور، سید غلام محی الدین قادری، "تین شاعر یعنی (میر تقی میر، میر انیس اور ہوریس اسمتھ) پر ایک تنقیدی نظر" شمس الاسلام پریس حیدرآباد دکن، ۱۹۲۶ء، ص ۷۶

۳۔ اختر علی تلہری، مولانا، تبصرہ (انیس کی شاعری پر) "بحوالہ شاہکار انیس" مرتبہ سید مسعود حسن رضوی۔ ص ۳

اعتراض کرنا بہت آسان ہے۔ ذرا سی جنبش قلم سے'' طومار اغلاط'' جمع ہو جاتا ہے لوگوں نے تو معاذ اللہ قرآن مجید پر بھی اعتراضات جڑ دیئے۔ انیسؔ خدائے سخن سہی مگر کسی انسان کا کلام حرف آخر نہیں ہو سکتا۔ مزید برآں کاتبوں اور نقل کرنے والوں کے قلم کی گلکاریاں۔ اگر انیسؔ کے کلام میں کہیں کہیں کوئی ایسی لغزش نظر آتی ہے تو بشریت کا تقاضا بھی ہے اور کاتبوں کی مہربانیوں کا نتیجہ بھی۔

مولوی عبدالغفور نساخؔ نے انتخاب نقص میں دبیر اور انیسؔ کے کلام پر خوب خوب اعتراضات فرمائے جن کے جوابات دیئے جا چکے ہیں تنقید کی ستم ظریفی کہ نساخ کو بھی انیسؔ کا نقاد بنا کر ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے۔

یہاں چند اعتراضات اور ان کے جوابات پیش کیے جاتے ہیں:

کہتے تھے نبیؐ امت بے دین نے مارا
ان باغیوں نے لوٹ لیا باغ ہمارا

مولوی صاحب کا اعتراض ہے کہ'' امت بے دین میں اعلان نون[1] جائز نہیں۔'' قدیم اردو میں اعلان نون جائز سمجھا جاتا تھا اس کی بہت سی مثالیں ملیں گی۔ چند اشعار نمونے کے طور پیش کئے جاتے ہیں تا کہ غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے۔

'' ناخدائے سخن نے یہاں تک کہہ دیا کہ'' مستند ہے میرا فرمایا ہوا'' انہی کا شعر ملاحظہ فرمائیے:

چشم بد دور کہ اب رنگ ہے کچھ گریہ پر
خون جھمکے ہے مرا دیدۂ گریان کے بیچ

(میر تقی میر ،متوفی ،۱۸۱۰ء)

میر نظام الدین ممنونؔ کا شمار استادوں میں ہوتا تھا اور جن کا انتقال ۱۸۴۴ء میں ہوا۔ یہ تقریباً انیسؔ کے معاصر ہوتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے:

وہ تفتہ جگر ہوں کہ دم ذبح سے اب تک ہے گرم مرے خنجر بُرّان کا لوہا[2]

مظہر علی خاں ولاؔ کا بھی شعر نقل کیا جاتا ہے ان کا تعلق دور متوسطین سے تھا آپ مصحفیؔ کے شاگرد تھے:

---

[1] نساخ ،مولوی عبدالغفور،'' انتخاب نقص'' ص ۲۴

[2] قاسم علی خان ،حکیم'' مجموعہ نغز'' ص ۲۱۳

ایک جیحوں ہے کہ پلکوں سے بہا آتا ہے　　　　کیا بلا ہے یہ مرے دیدۂ گریان کے بیچ

....

ع　اثر ایہ سخن کہہ کے وہ کونین کا عالی

اعتراض یہ ہے کہ ''کونین کا عالی غلط ہے[1] یہ طباعت کی غلطی ہے یا ہوسکتا ہے کسی کاتب کی اصلاح ہو۔ صحیح مصرع ہے:

ع　اثر ایہ سخن کہہ کے وہ کونین کا والی

انیس مرحوم ''عالی'' اور ''والی'' کے فرق کو نہ سمجھ سکے معاذ اللہ یہ ''سوئے ظن'' ہے

قاسم سے بھی لو ہم کو چھڑاتا ہے مقدر

رانڈ ہوتی ہے اک رات کی بیاہی ہوئی دختر[2]

''اس شعر میں ہوتی کی 'ی' تقطیع میں گر جاتی ہے یہ جائز نہیں''

انیس مرحوم سے زیادہ یہ اردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ ان کا کلام صحت کے ساتھ اب تک شائع نہ ہو سکا۔ صحیح مصرع ہے:

''بیوہ ہوئی اک رات کی بیاہی ہوئی دختر''

جن جن کے پسر ہو گئے تھے دشت میں بے جان　　ان سوگ نشینوں سے یہ بولے شہ ذیشان

''سوگ نشین'' کا لفظ فارسی زبان میں نہیں آیا اور اس کو ہندی بھی نہیں کہہ سکتے کہ ترکیب اس کی فارسی ہے اور دونوں لفظ بھی فارسی ہیں۔''[3]

ترکیبوں کے بارے میں عرض کرنا ہے کہ اہل زبان کو ترکیب سازی کا مکمل حق حاصل ہے اگر ایسی ترکیبوں سے نثر نگار یا شاعر کے مفہوم کی وضاحت ہوتی ہے تو ان سے زبان میں قابل قدر اضافہ ہوگا بہت سے نثار اور شعرا نے ترکیبیں وضع کیں جن کو قبول خاطر نصیب ہوا۔ اور وہ اردو ادب کا سرمایہ بن گئیں غالب نے کتنی عمدہ ترکیبیں وضع کیں۔'' جدید ترکیبیں وضع کرنے کے نازک فن میں آج تک کوئی ان سے

---

[1] نساخ، مولوی عبدالغفور، بحوالہ بالا ص ۲۵

[2] نساخ، مولوی عبدالغفور، بحوالہ بالا ص ۲۵

[3] خلیق، میر مستحسن، (متوفی ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء)

(یعنی انیس) سے آگے نہ جا سکا[1] آج کل کے شعراء میں حضرت جوش نے نئی نئی ترکیبوں کی اختراع سے زبان کو کس قدر مالا مال کیا ہے۔

ملک نشین، تخت نشین، خاک نشین اور تہہ نشین کو قبول کر لیا اور ''سوگ نشین'' پر اعتراض جڑ دیا۔ آخر کیوں؟

بس اے انیس بس کہ دعا کا ہے یہ مقام ہو مغفرت خلیق[2] کی یارب ذوالکرام

''اس لفظ میں ''ذوالکرام'' کے کچھ معنی نہیں مہمل ہے کیونکہ ''کرام'' جمع ''کریم'' کی ہے نہ کہ ''کرم'' کی۔''[3] انیس مرحوم کو عربی اور فارسی زبانوں پر بھی عبور تھا اس قسم کی غلطیوں کو اُن کی طرف منسوب کرنا اپنی بدذوقی کا ثبوت دینا ہے۔ صحیح مصرع حسب ذیل ہے:

''ہو مغفرت خلیق کی یا خالق انام''

نالاں ہے تجھ سے روح رسول فلک اساس اتنا بھی دل نہ سخت کر اے ناخدا شناس

دوسرے شعر میں گردوں اساس آیا ہے۔

اعتراض ہے کہ ''فلک اساس اور گردوں اساس کسی انسان کے وصف میں نہیں آتا۔''[4] رسول اکرم بشر ضرور تھے لیکن ایسے بشر جن پر وحی آیا کرتی تھی وہ خیر البشر بھی تھے اور افضل الانبیاء بھی۔ حضور ہی کی شان میں تو حدیث قدسی ہے ''لولاک لما خلقت الافلاک'' (اے رسول اکرمؐ تم نہ پیدا ہوتے تو کائنات کا وجود بھی نہ ہوتا تمہاری وجہ سے تو زمین و آسمان پیدا کیے گئے) رسولؐ پاک کو دل سے ماننے والوں کے لیے تو وہ فلک اساس اور گردوں اساس سب ہی کچھ تھے اور ''بعد از خدا بزرگ تو ئی قصہ مختصر'' کے مصداق۔ اس سلسلے میں یہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ انیس کو قواعد کا پابند نہیں ہونا چاہیے بلکہ قواعد ان کی مقرر کردہ شاہراہوں پر چلے اور ان کے طرز ادا کی روشنی میں قوانین فصاحت و بلاغت مرتب کیے جائیں۔ اگر تعصب کی عینک کو اتار کر انیس کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو بالاتفاق کہنا پڑے گا کہ جس طرح عروس سخن کو انھوں نے سنوارا وہ انہی کا حصہ تھا۔ پروفیسر قادری صاحب فرماتے ہیں:

---

[1] خلیق، میر مستحسن، (متوفی ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء)

[2] ناسخ محولہ بالا، ص ۲۷

[3] ناسخ محولہ بالا، ص ۲۷

[4] ناسخ محولہ بالا ص ۲۸

''واقعہ یہ ہے کہ میر انیسؔ کا کلام اعجاز کی حد تک پہنچا ہوا ہے ہر مضمون انھوں نے اعلیٰ سے اعلیٰ لکھا ہے۔'' [۱]

میر انیسؔ کی زبان کے بارے میں نقادوں کی آراء:

میر صاحب مرحوم کی زبان کے بارے میں چند نقادوں کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

''میر انیسؔ کی شاعری میں ایک بڑا کمال یہ ہے کہ جس موقع پر جو الفاظ خاص اثر دے سکتے ہیں وہی الفاظ استعمال کرتے ہیں اور بی بی اور کنیز اور آقا و خادم چھوٹے بڑے کے مخصّصاتِ ادب کے لیے جو الفاظ مناسب ہیں وہی صرف کرتے ہیں۔

میر انیسؔ ثقیل لفظوں اور تعقید کلام کو بالکل ناپسند کرتے ہیں اور ان کو کیسا ہی مضمون ہاتھ لگے لیکن جب تک وہ فصیح لفظوں کو ڈھونڈ نہیں لیتے اس مضمون کو داخل نظم کرنے پر متوجہ نہیں ہوتے میر انیسؔ کا کلام بلاغت کی جان سلاست کی روح اور فصاحت کی کان ہے۔'' [۲]

''اردو زبان ان کی خانہ زاد کنیز اور فصاحت بیان ایک ادنیٰ پرستار بلکہ پرستار زادی تھی۔ اللہ اللہ کیا سحر بیانی تھی کہ جس کے سامنے فصحاء و بلغائے سلف کی توصیف ایک پارینہ کہانی تھی۔ مرثیہ گوئی کو ایسے معراج کمال پر پہنچا گئے کہ اسے ایک جداگانہ علم بنا دیا۔ رزم کے بیان سے رستم دلوں کو ہلا دیا۔ بزم کے ذکر سے شاہی درباروں کو شرما دیا۔ فطرت نے وہ بلا کی ذہانت و ذکاوت عطا کی تھی بات میں بات نکالتے تھے جن محاوروں کو چاہا باندھ کر چار چاند لگا دیئے ایسے لوگ اب کہاں ہیں۔ جو لطف زبان کے دلدادہ اور فریفتہ ہیں وہ آج تک انیسؔ کو روتے ہیں اور ہمیشہ روتے رہیں گے۔'' [۳]

''اور سچ پوچھیے تو انیسؔ و دبیرؔ کی شاعرانہ عظمت بیشتر انھیں خارجی مضامین کی وجہ سے قائم ہے واقعات کی یکسانیت کو دلچسپ بنانے کا دوسرا طریقہ تھا خوب صورت دل کش

۱۔ حامد حسن قادری، ''مختصر تاریخ مرثیہ گوئی'' اردو اکیڈمی سندھ، ص ۱۰۲

۲۔ اشہری، سید امجد علی، ''حیات انیسؔ'' مطبع آگرہ اخبار، ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء ص ۶۴

۳۔ سری رام، لالہ ''خم خانۂ جاوید'' جلد اول، مخزن پریس دہلی، ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء ص ۹۵‌ـ ۴۹۶

اور تازہ الفاظ کا استعمال اور الفاظ کے فن میں اردو شاعری ابھی تک انیسؔ کا جواب پیدا نہیں کر سکی۔''[۱]

''بیان کرنے کے لیے نئے اسلوب اردو شاعری نے بہ کثرت پیدا کر دیئے واقعہ کو سو سو طرح سے بیان کر کے قوت متخیلہ کی جولانیوں کے لیے ایک نیا میدان صاف کر دیا اور زبان کا ایک معتد بہ حصہ جس کو اب تک شاعروں کے قلم نے مس تک نہیں کیا تھا اور جو محض اہل زبان کی بول چال میں محدود تھا اس کو شعراء سے روشناس کر دیا۔''[۲]

اس طرح اردو زبان کو کوتاہ دامانی کا شکوہ نہ رہا۔ انیسؔ نے اردو زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں جو اضافہ کیا اس پر اردو ادب بجاطور پر فخر کر سکتا ہے ان کے کلام میں شرفا کا روزمرہ ہے اور سلاست ہے لب و لہجے میں متانت ہے صنعتیں ایسی ہیں جن کو سامعین جلد سمجھ لیتے ہیں۔

میر انیسؔ اور مرثیہ کا کمال:

مضمون کے آخر میں ایسے نقادوں کی آرا نقل کی جا رہی ہیں جن کے نقطۂ نگاہ سے میر انیسؔ نے مرثیہ کو کمال کی آخری منزل تک پہنچا دیا اور اب بظاہر ترقی کے امکانات نظر نہیں آتے۔

ایک مشہور محقق نے شاعری عظمت کے معیار کی بھی وضاحت فرما دی۔

''انیسؔ اپنے کلام میں شروع سے آخر تک اپنی روایات خاندانی پر نظر رکھتے ہیں۔ یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ وہ ''جگہ'' کو ''جاگہ'' کہتے تھے اور اکثر آئیاں بجائیاں بھی بول جاتے تھے اور مزید کہتے تھے کہ یہ میرے گھر کی زبان ہے۔ حضرات لکھنؤ اس طرح نہیں فرماتے۔''[۳]

ڈاکٹر صاحب نے شاعری عظمت کا جو معیار مقرر فرمایا ہے وہ کس قدر صداقت پر مبنی ہے آپ فرماتے ہیں:

''انیسؔ کا کلام ہر شخص کو متاثر کر سکتا ہے خواہ وہ عالم ہو یا عامی عقیدت مند ہو یا غیر عقیدت مند۔''[۴]

۱۔ فیض، فیض احمد، ''میزان'' طبع اول، مطبوعہ نقوش پریس لاہور: فروری ۱۹۲۲ء، ص ۱۲۹۔ ۱۳۰

۲۔ عبدالحئی، سید، ''گل رعنا'' (تذکرہ شعرائے اردو) مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۴ء ص ۵۱۱۔

۳۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر ''لکھنؤ کا دبستان شاعری'' طبع ثانی، اردو مرکز لاہور، ۱۹۶۷ء ص ۷۴۵

۴۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر بحوالہ بالا، ص ۷۶۳

"مرثیہ گوئی میں مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ نے اس فن کو اس درجہ تک پہنچا دیا جس سے آگے ترقی کا راستہ بند ہوگیا اور سچ تو یہ ہے کہ نہ صرف مرثیہ گویوں بلکہ نکتہ سنج شعراء میں یہی دو بزرگوار ہیں جو آسمان بلاغت کے مہر و ماہ کہے جاسکتے ہیں ان کا ایک ایک مرثیہ بلاغت کا تاج سر اور ایک ایک شعر بلکہ ایک ایک لفظ پیکر فصاحت کی جان ہے۔"[1]

"اسی مرثیہ خوانی کی ضرورت وقدر نے میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ پیدا کیے جو کمال شاعری کے اعلیٰ ترین شہ نشین پر پہنچ گئے۔ یا تو یہ مثل مشہور تھی کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو یا لکھنؤ کے کمال مرثیہ گوئی نے سارے ہندوستان سے منوالیا کہ عالم شعر و سخن میں مرثیہ گوئی کا مرتبہ دیگر اصناف سخن سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔"[2]

"میر انیسؔ کا کلام ہموار ہے اور دوسرے شاعروں کی طرح رطب و یابس کا مجموعہ نہیں ہے اردو ادب میں میر انیسؔ ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں بحیثیت شاعر کے ان کی جگہ صف اول میں ہے اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو ان کو زبان اردو کے تمام شعراء سے بہتر اور کامل تر سمجھتے ہیں اور ان کو ہندوستان کا شیکسپیئر اور خدائے سخن اور نظم اردو کا ہومر[3] ورجل[4] اور بالمیک[5] خیال کرتے ہیں۔[6]

"مرثیہ نگاری کے آخری دور میں میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ نے مرقع نگاری اور معرکہ آرائی کے ہنگامے کو شامل کر کے اپنے زور بیان سے مرثیہ کو کمال پر پہنچا دیا۔"[7]

۱۔ فوق، سید ظہیر الحسن "المیزان" مطبع فیض عام علی گڈھ، ص ۲

۲۔ شرر، مولوی عبدالحلیم "مضامین شرر" (ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ) یعنی گزشتہ لکھنؤ بار اول: مرکنٹائل پریس لاہور، ص ۳۲۱

۳۔ یونانی شاعر ہومر (HOMER) نے سب سے پہلے ایپک لکھی اس کی نظم (ILIAD) میں سولہ ہزار اشعار ہیں۔

۴۔ اطالوی شاعر ورجل (VIRGIL)۔ کی ایپک (AENIAD) دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔

۵۔ والمیک کی رامائن سنسکرت ایپک ہے اس میں اڑتالیس ہزار اشعار سے زائد ہیں۔

۶۔ رام بابو سکسینہ "تاریخ ادب اردو" (ترجمہ) مرزا محمد عسکری دوسری بار مطبوعہ نامی پریس لاہور۔ ناشر عشرت پبلشنگ ہاؤس ص ۳۲۴۔

۷۔ سخاوت مرزا "قدیم دکنی شعرا کے چند نایاب مرثیے" (رسالہ سہ ماہی) "اردو" کراچی: ۴ جون، ۱۹۶۹، شمارہ ۳۳ ص ۱۷

"واجد علی شاہ کے 'سبعہ سیارہ' آج تاریخ ادب میں کوئی مقام نہیں رکھتے اس کے بر عکس انیس و دبیر فلک نظم پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے حالانکہ نہ وہ درباری شاعر تھے نہ خزانہ شاہی سے مستقل تنخواہ پاتے تھے۔"[1]

"انیس نے بھی تمام ادبی روایات کو نچوڑ کر ترقی کے تمام امکانات اپنے مرثیہ میں اس طرح سمو دیئے ہیں کہ اس میں تازگی، وسعت اور عظمت پیدا ہوگئی ہے اب اس کی تخلیقات کا جواب اس وقت تک کوئی پیدا نہیں کر سکتا جب تک اردو زبان کا مزاج نہ بدل جائے۔"[2]

نقادان انیس نے ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ان کی شاعری کے محاسن بیان کئے اس کے ساتھ مصوری، منظر نگاری، جذبات نگاری، واقعہ نگاری اور رزمیہ شاعری پر اظہار خیال فرمایا۔ انیس کی زبان اور محاوروں پر تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کئے ان کی نادر تشبیہات اور استعارات پر دل سے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ شاعری کی عظمت کے پرکھنے کا معیار بتا دیا۔ مرثیہ کے موضوع پر بحث کی اور انیس نے جو اس میں تنوع پیدا کیا اس کا بیان بھی کیا اور مرثیہ کی ترقی میں میر صاحب نے کیا کیا کارنامے انجام دیئے۔ ایسے بھی نقاد ہیں جنھوں نے انیس کی زبان ترکیبوں اور محاوروں پر اعتراضات کیے۔ بہر حال "نظر اپنی اپنی قلم اپنا اپنا"

انیس مرحوم کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مرثیہ اور انیس مترادف ہو گئے۔ مرثیہ کا لفظ سنتے ہی سننے والے کا ذہن فوراً خدائے سخن کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ جب تک مہر کے پرتو میں چمک موجود ہے اس وقت تک اقلیم سخن میر صاحب کے قلم رو سے باہر نہیں جا سکتی۔ ان کے مراثی کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ:

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

☆☆☆

---

[1] ذاکر حسین فاروقی، ڈاکٹر "دبستان دبیر" بار اول: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ لکھنؤ مئی ۱۹۶۶ء ص ۱۳۰

[2] صفدر حسین، ڈاکٹر سید "اردو مرثیہ عہد بہ عہد" (ماہنامہ) "نگار" (پاکستان) کراچی ۱۹۶۷ء، (سالنامہ اصناف شاعری نمبر ص ۲۱۶

خان بہادر مولوی سید خیرات احمد مرحوم

مطلعِ انوار

سید خیرات احمد مرحوم ۶/ ستمبر ۱۸۴۸ء کو صوبۂ بہار کے گیا ضلع میں ایک ذی علم خاندان میں پیدا ہوے۔ شروع میں عربی اور فارسی کی تعلیم پٹنہ میں ہوئی اور پھر گیا سے میٹرک کا امتحان اوّل درجہ میں پاس کیا۔ اس کے بعد پٹنہ کالج سے بی۔اے۔ اور پھر بی۔ایل۔ کا امتحان پاس کر کے گیا میں وکالت شروع کر دی جس میں وہ بے حد کامیاب رہے۔

اُنہیں شاعری کا بھی شوق تھا اور اپنی ذہانت کی وجہ سے مشاعرہ ہو یا مجلسِ عزا یا کوئی دینی مُباحثہ، ہر محفل میں کامیاب رہے۔

عزاداریٔ حسین اور مداحیٔ اہلبیت اُن کا مذہب تھا لیکن ہر طرح کے تعصب سے پاک۔ بے حد روشن دماغ تھے۔ آپ فنِ شاعری اور اس کی نزاکتوں سے بدرجۂ اتم آشنا تھے۔ نثری کاوشوں میں بھی اچھی دست رس رکھتے تھے۔ اِن کی دینی، سیاسی اور ادبی تصانیف خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہیں۔ اِن کی سب سے مشہور تصنیف "نورِ ایمان" ہے جو سب سے پہلے ۱۸۹۹ء میں چھپی اور آج تک اس کے اڈیشن شائع ہو رہے ہیں۔

۲۶/ مئی ۱۹۴۱ء کو اِنتقال ہوا اور وطن ہی میں سپردِ خاک کیے گئے۔

خیرات احمد صاحب مرحوم و مغفور نے اس تحریر کی وجہ تالیف بیان فرماتے ہوئے لکھا تھا: "میں نے یہ رسالہ مطلعِ انوار (۱۳۴۳ھ) اس غرض سے لکھا تھا کہ جناب میر انیسؔ صاحب مرحوم و مغفور اعلیٰ اللہ مقامہٗ کا کلام پاک جو تجدیداً حیدر آباد میں چھپ رہا ہے اُس کی جلد سویم میں بطورِ دیباچہ کے درج کیا جائے لیکن ...... معلوم ہوا کہ جلد سویم کی اشاعت میں ابھی بہت توقف ہے اس لیے میں نے اس رسالے کو واپس منگوالیا اور اب اس کو ...... شائع کرتا ہوں اور نام اس کا مطلعِ انوار رکھتا ہوں تا کہ

جناب میر صاحب مرحوم کے کلامِ پاک کی روشنی تمام عالم میں پھیلے اور جمہورِ انام۔ شیعہ، سُنی، ہندو، مسلمان سمجھیں کہ اُن کے ملک میں کیسا شاعر عالی دماغ اور نورانی قلب پیدا ہوا تھا اور اُس نے اردو زبان کو کس معراجِ کمال پر پہونچایا ہے۔" آگے فرماتے ہیں: "..... میں اگر فقط ایشیائی شاعری سے بحث کرتا تو اکثر شعراء ایران و ہندوستان مدِ مقابل میں پیش کیے جاتے اور اگر فطری شاعری پر زور دیتا تو یوروپ کے شعراء ہومر، ورجل، ملٹن، شیکسپیئر مقابلے کو کھڑے ہوتے جاتے لیکن مقدس شاعری یعنی روحانیات اور الٰہیات کو سلسلۂ نظم میں لانا میر انیس مرحوم کا حصہ ہے..... اور ناظرین سے بھی التماس ہے کہ اِسی نقطۂ خیال سے اس کلام پاک کو ملاحظہ فرمائیں اور حق تعالیٰ جلّ شانہٗ کا شکر بجالائیں کہ اُس خلاقِ عالم نے اس ہندوستان میں ایک ایسا عالی دماغ اور نورانی قلب شاعر پیدا کیا تھا۔"

اِس مضمون میں انیس کی شاعری کو خود مصنف کے الفاظ میں بنیادی طور پر رُوحانیت اور الٰہیات، کے نقطۂ نظر سے دیکھا گیا ہے۔ کلام کے ادبی معیار و حُسن کو بھی اِسی بنیادی نقطۂ نگاہ کے تحت سمجھا اور بیان کیا گیا ہے۔ امام حسین اور ان کے مدّاح، دونوں کی عقیدت سے ــــ جوان کے دور کی بہت ممتاز خصوصیت تھی ــــ مصنف اس قدر سرشار ہے کہ ہم اس تحریر کو دونوں کا قصیدہ کہہ سکتے ہیں۔ یوں بھی اردو ادب میں تنقید کے فن کی اس وقت تک باقاعدہ ابتدا نہیں ہوئی تھی۔ مضمون کی طوالت کی وجہ سے صرف مختصر اقتباسات پر اکتفا کیا گیا ہے۔

(مرتب، بہ تعاون سید تنویر الحسن حفید جناب سید خیرات احمد مرحوم)

"جناب میر انیس مرحوم مغفور کے کلامِ پاک سے مجھ کو زمانہ طفولیت ہی سے خاص دلچسپی رہی اور ۳۵ برس تک حضرت کے کلامِ پاک کی بر منبر ذاکری کرتا رہا اور اس کو مذہباً اپنا فرض دینی سمجھتا رہا اس لیے حضرت کے کلام کا ذائقہ میری فطرت میں داخل ہو گیا۔

میرے مذاق شاعری کا بھی تین زمانہ ہوا۔ اول تو وہ تھا جب رعایات لفظی پر شیدا تھا اور اسی کو انتہائے کمال سمجھتا تھا۔ دوسرا زمانہ وہ ہوا کہ صنائع و بدائع اور نازک خیالی پر عاشق رہا۔ تیسرے زمانے میں بی۔ اے کے امتحان میں ملٹن کے پیراڈائز لاسٹ اور شیکسپیئر کی فطرتی شاعری نے دل

پر گہرا اثر پیدا کیا اور اب دل معنوی شاعری کی طرف بالکل مائل ہو گیا۔

"اِن سب نقاط خیال سے جب میں نے میر انیسؔ مرحوم کے کلام پاک کو غائر نظر سے دیکھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ یہ ہندوستانی شاعر ہر اعتبار سے سر آمد شعرا معلوم ہوتا ہے اور معنوی شاعری اسی کا حصہ ہے۔"

شاعری کو تین قسموں — ۱ زبان و جذبات کی شاعری، ۲ آثار و مناظر قدرت کی شاعری ۳ الہیاتی یا روحانی شاعری میں تقسیم کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"تیسری قسم کی شاعری یہ ہے کہ خاصان خدا نے خدا کی راہ میں کیسے کیسے کارنمایاں کیے ہیں اور اُس میں جہاد نفس کا کیسا کیسا معرکہ عظیمہ جھیلا ہے اور صبر و رضا کے کیسے کیسے جوہر دکھائے ہیں ان امور کو سلسلہ نظم میں منظوم کرنا اس قسم کی شاعری، خاص حصہ حضرات مداحان اہلبیت علیہم السلام یعنی مرثیہ گویوں کا، مخصوص جناب میر انیسؔ صاحب مرحوم و مرزا دبیر صاحب مغفور کا اور بعض حضرات اہل تصوف کا ہے — میں اپنے خیال سے اس قسم کی شاعری کو مقدس شاعری کہتا ہوں۔

میں نے اس اصول سے جناب میر انیسؔ صاحب مرحوم مغفور اعلیٰ اللہ مقامہ کے کلام پاک کو جو دیکھا تو ہر قسم کی شاعری میں آپ کو اعلیٰ اور افسر پایا۔" ....

الٰہیات، کلام حق تعالیٰ جلشانہٗ

مرثیہ — آج شبیرؑ پہ کیا عالم تنہائی ہے

".......جناب امام حسین علیہ السلام حق تعالیٰ کے محبوب ہیں۔ یہ امام ابن امام علیہما السلام ---- میدان کربلا میں وارد ہے۔--- اب خود بنفس نفیس شہادت کے لیے تیار ہے --- اور خود زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے گرنے پر ہے --- کیا ممکن ہے کہ بغیر الہام کے کوئی شخص ایسے امام عالی مرتبت و عالیمقام کے دل کی بات کو نظم کر سکے، مگر دیکھیے کہ انیسؔ مرحوم اس وقت اس مظلوم کی قلبی مناجات کو اور راضی برضا رہنے کو کس متانت اور حفظ مراتب سے نظم کرتے ہیں۔

اب اگر ہے یہ تری مصلحت اے رب قدیر — ہو رواں حلق پہ اس پیاسے کے آب شمشیر
میرے مولیٰ بسر و چشم ہے حاضر شبیر — حکم حاکم میں یہ طاقت ہے کروں میں تاخیر

جلد گردن پہ رواں خنجرِ بران ہوے
اے خوشا وہ جو تری راہ میں قربان ہوے

تقویت دل کو کرم سے ہے تیرے یار حمٰن — نہیں مایوس کہ رحمت ہے تیری بے پایان
مشکلیں بندوں کی کر دیتا ہے دم میں آسان — شکر الطاف و عنایات میں قاصر ہے زبان

عاصیوں سے بھی محبت نہیں کم کرتا ہے
جرم وہ کرتے ہیں تو لطف و کرم کرتا ہے

اب قابلِ غور ہے کہ ایسے امام عالیمقام خدا کے محبوب کے پیارے فرزند کی ایسی مناجات کے جواب میں حق تعالیٰ جلشانہ کیا فرمائیگا ۔۔۔ کیا بغیر الہام کے بشر سے اس کا جواب ہونا ممکن ہے؟ ہرگز نہیں! مگر دیکھیئے خدا ہی کا بندہ انیس اس فرمان خداوندی کو کس طرح نظم کرتا ہے.

تو بھی مقبول ہے اور تیری عبادت بھی قبول — یہ اطاعت بھی ہے مقبول یہ طاعت بھی قبول
عاجزی بھی تیری مقبول شہادت بھی قبول — تیری خاطر سے ہمیں بخشش امت بھی قبول

ہم نے خیل شہدا کا تجھے سردار کیا
امت احمد مختار کا مختار کیا

تجھ سا عابد نہ ہوا ہے نہ کوئی ہوئیگا — تیر کھا کھا کے کسی نے بھی ہے یوں شکر کیا
طاعت خلق سے اِک سجدہ ہے افضل تیرا — عرش اعظم پہ ملائک تیری کرتے ہیں ثنا

سارا گھر میری محبت میں فدا تو نے کیا
بندگی کا تھا جو کچھ حق وہ ادا تو نے کیا

حشر تک روئیگا مظلومی پہ تیری عالم — تیرا ماتم نہیں ہوئیگا جہاں میں کبھی کم
روضۂ پاک کو تیرے یہ شرف بخشیں گے ہم — آئینگے جس کی زیارت کو ملائک پیہم

یہ زمیں عرش سے رتبے میں سوا ہوئیگی
خاک تربت کی تری خاکِ شفا ہوئیگی

حضرات ناظرین پہلے ذرا غور تو فرمایئے کہ ذرا بھی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بندوں کی مناجات عاجزانہ اور ان دوسرے بندوں کا فرمان شاہنشاہی و کبریائی ایک ہی شخص کا لکھا ہوا ہے؟
پھر دونوں کلام کی فصاحت بلاغت متانت حفظِ مراتب پر غور کر کے فرمایئے کہ سوائے

صحیفۂ کاملہ کے جو عربی میں ہے اور کسی اردو کلام میں عبد و معبود کے مراتب اور مدارج اس خوش اسلوبی سے بیان ہوے ہیں؟

میں نے اب تک نہیں دیکھا جب ہی تو بعض حضرات سخن سنج اور سخنور نے کہ دیا کہ اگر حق تعالیٰ جلشانہ قرآن مجید اُردو میں نازل کرتا تو اُس کی زبان انیس کی زبان ہوتی۔

دوسرا کلام الٰہی

مرثیہ:۔ جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے

اب وقت عصر پہونچ گیا اور وعدہ وفائی کی ساعت آ گئی۔ حضرات ناظرین غور فرمائیں کہ کس تالیف قلب اور کس حسن طلب سے حق تعالیٰ جلشانہ اپنے عاشق صادق کو یہ بات یاد دلاتا ہے۔

آئی صدائے غیب کہ شبیر مرحبا اس ہاتھ کے لیے تھی یہ شمشیر مرحبا
یہ آبرو یہ جنگ یہ توقیر مرحبا دکھلا دی ماں کے دُودھ کی تاثیر مرحبا
غالب کیا خدا نے تجھے کائنات پر
بس خاتمہ جہاد کا ہے تیری ذات پر

بس اب نہ کرو غا کی ہوس اے حسینؑ بس دم لے ہوا میں چند نفس اے حسینؑ بس
گرمی سے ہانپتا ہے فرس اے حسینؑ بس وقتِ نمازِ عصر ہے بس اے حسینؑ بس
پیاسا کوئی لڑا نہیں یوں ازدہام میں
اب اہتمام چاہیئے امت کے کام میں

کیا واقعی یہ بند میر انیس نے کہے ہیں؟ سبحان اللہ! سبحان اللہ!! حق تعالیٰ جل شانہ نے ایک ہندوستانی شاعر کو کیسا منور قلب عطا فرمایا ہے کہ وہ اُسے حق تعالیٰ جلشانہ کی باتوں کو اس فصاحت اور بلاغت اور حفظِ مراتب سے نظم کرتا ہے۔۔۔۔

واہ رے میر انیسؔ کی پاک طبیعت اور واہ رے اُن کی نورانی تخیل کہ خدائے عزوجل کے ایسے نازک امر میں سب باتوں کا لحاظ کر کے اس رضائے پروردگارِ عالم کو کس خوش اسلوبی اور کس دل پسند کنائے سے موزوں کر دیا یعنی اپنے عاشق صادق کی ایک محبوب شے کا یعنی امت کے کام کا اشارہ کر کے فرما دیا ''اب اہتمام چاہیئے امت کے کام میں!'' سبحان اللہ جزاہ اللہ فی الدارین خیرا۔

کیا بغیر الہام کے بشر حکم خدا کو اس حسنِ طلب اور اس متانت سے موزوں کر سکتا ہے؟ کیا مجال!!!
اس لیے اگر اس ایک مصرعہ کو سو مرثیہ یا دفتر فصاحت کہیئے تو ہرگز غلط نہیں ہے۔

روحانیات

......حق تعالیٰ جلشانہ نے ایک ہندوستانی شاعر انیسؔ کو کیسی قدرت عطا فرمائی اور اُس کے قلبِ پاک کو کیسا نور بخشا ہے کہ وہ خاصان خدا کے ارواح پاک کی باتوں کو اس پاک و صاف طریقے سے نظم کرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے بلکہ اکثر یقین ہو جاتا ہے کہ وہی ارواح پاک بول رہی ہیں۔ یہ بات بغیر الہام کے غیر ممکن ہے اس لیے میرا اعتقاد ہے کہ اور حضرات مداح دنیا میں آ کر اپنے کسب علوم سے نامور ہوتے گئے لیکن انیسؔ مرحوم وہیں سے مداح بنا کر بھیجے گئے تھے اور مدارجِ اعلیٰ پر فائز ہوئے دو چار باتیں روحانیات کی ملاحظہ ہوں۔

کلام روح پاک جناب حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ والہ وسلم

مرثیہ:۔ کعبہ سے کیا جبکہ سفر قبلۂ دیں نے

رو کر یہ کہا میں نے کہ یا شاہ خوش اقبال — بندہ تو ہے آفت میں یہ کیا آپ کا ہے حال
فرمایا میں صدقے ترے اے فاطمہ کے لال — کھیتی کو مری دشمنِ دیں کرتے ہیں پامال
راحت کا محمدؐ کی سرانجام کہاں ہے
جب تو ہوا بےچین تو آرام کہاں ہے

ہے تیری شہادت مرے معشوق کو منظور — تا عاشق صادق رہے تو خلق میں مشہور
حیدرؑ کی طرح دل ہے ترا صبر سے معمور — تجھ سے تو وہ ہوگا جو کسی کا نہیں مقدور
ہے قول کا صادق تیری کیا بات ہے بیٹا
حرمت مری امت کی تیرے ہاتھ ہے بیٹا

مرثیہ:۔ یارب کسی کا باغ تمنا خزاں نہ ہو

آپ نے عالمِ بیقراری میں اپنے جد امجد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یاد کر کے فرمایا:
نانا بس اب نواسے کو جلدی بلایئے — مقتل میں آ کے حال مرا دیکھ جایئے

کوثر سے جام بھر کے کوئی ساتھ لایئے　　　پیا سا ہوں تین روز کا پانی پلایئے
ہوتا ہے وہ ستم جو مروت سے دور ہے
امت سے پوچھیے کہ مرا کیا قصور ہے

اس قسم کی شکایت یا طلب امام حسین علیہ السلام کسی دوسرے سے نہیں کرتے بلکہ اپنے نانا جان صلعم سے کرتے ہیں اس کے جواب میں:

آئی صدا اے حضرتِ محبوب کردگار　　　اے بیکس و غریب مسافر ترے نثار
پیارے میں دیکھتا ہوں یہ سب تیرا حال زار　　　امت نہ سمجھی ہائے تجھے میری یادگار
تجھ پر نہیں یہ پیاس کے صدمے گذرتے ہیں
خنجر سے اہلِ ظلم مجھے ذبح کرتے ہیں

روتے ہیں آج صبح سے حیدر ترے لیے　　　شبیر بیقرار ہے شبّر ترے لیے
پھرتی ہے مضطرب تری مادر ترے لیے　　　میں پیٹتا ہوں اے مرے دلبر ترے لیے
خالی ہے اے حسین تری جا بہشت میں
تو میرے پاس رات کو ہوگا بہشت میں

مرثیہ:　　　مومنوں خانۂ زہرا پہ تباہی ہے آج

واقعہ یہ ہے کہ جب جناب امام حسین علیہ السلام بعد شہادت جمیع انصار و اعزہ و اقارب کے میدانِ کربلا میں یکہ و تنہا زخموں سے چور ہو کر قریب ہے کہ گھوڑے سے گریں تو اُس وقت آپ نے اُس گھوڑے سے جو حضرت رسول اللہ صلعم کے وقت سے آپکی سواری میں تھا فرمایا:

خلق سے سوئے عدم کوچ کی تیاری ہے　　　آخری اب ترے آقا کی یہ اسواری ہے

تو جو تین دن سے بے آب و دانہ و کاہ بھوکا پیاسا ہے تو مجھے حجاب آتا ہے۔ گھوڑے نے بزبان حال عرض کیا کہ میری پیاس کا مطلق غم نہ کھایئے آپ جب بچپن میں مجھ پر سوار ہوتے تھے تو خود جناب رسول خدا صلعم بازو پکڑ کے مجھ کو تاکید فرماتے تھے کہ قدم آہستہ اُٹھانا ایسا نہ ہو کہ میرا فرزند تیری پشت سے گر پڑے مگر افسوس آج وہ دن ہے کہ۔　تیر پڑتے ہیں لگا جاتا ہے بھالا کوئی
آپ کا آج نہیں تھامنے والا کوئی

اس پر:

رو کے کہنے لگے رہوار سے شاہِ دو جہاں　　اب تو بیکس ہوں میں وہ چاہنے والے ہیں کہاں
سر پہ نانا ہیں نہ بابا ہیں نہ اب ہیں اماں　　دوست سب گلشنِ ہستی سے گئے سوئے جناں
یاس واندوہ سے ہے فرق توانائی میں
کوچ دنیا سے ہے کس عالمِ تنہائی میں

روحِ پاک رسولخدا صلعم بیتاب ہوگئی:

آئی پہلو سے یہ محبوبِ الٰہی کی صدا　　ہے محمدؐ تو بڑی دیر سے حاضر بیٹا
میرے بیکس میرے مظلوم غریب وتنہا　　میں تری پیاس کے صدقے تری ہمت پہ فدا
تجھ سے بے جرم وخطا اہلِ ستم لڑتے ہیں
تیر سارے یہ کلیجے پہ مرے پڑتے ہیں

تیری ماں خلد سے یاں آئی ہے کھولے ہوئے سر　　کہتے ہیں شیرِ خدا ہائے پسر ہائے پسر
بوسے لیتے ہیں ترے زخمِ بدن کے شبّر　　گرد پھر کے ترے روتے ہیں عقیل و جعفر
عرش سے آئے ہیں قدسی ترے لینے کے لیے
انبیا آئے ہیں پُر سا مجھے دینے کے لیے

حضرات ناظرین اس آخری بیت کی فصاحت اور بلاغت کی شرح کما حقہ مجھ سے قصیر العلم شخص سے ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں! سابقاً اکثر لوگ سمجھے تھے کہ بلاغت اُس کو کہتے ہیں جس میں الفاظ مغلق اور لغت غیر مانوس استعمال کیے جائیں مگر خدا جنت نصیب کرے مولانا شبلی مرحوم کو کہ انھوں نے سمجھا دیا کہ جو کلام فصیح نہ ہو وہ بلیغ ہو نہیں سکتا بلکہ کلام بلیغ وہی ہے جس کے الفاظ نہایت سلیس شستہ ورفتہ عام فہم ہوں مگر معنی اُس کے نہایت وسیع ہوں جن کی شرح دشوار ہو۔ مثالیں تو بہت ہیں مگر اس وقت مثال کے لیے یہی شعر کافی ہے کہ ظاہر الفاظ تو اس کے ایسے سلیس اور عام فہم ہیں کہ ہر خاص و عام اس کو سمجھ کر اثر لیتا ہے لیکن غور کرنے سے اس کی بلاغت انتہائی قیاس سے زیادہ معلوم ہوتی ہے.........

اس کے بعد خیرات احمد صاحب نے مختلف مرثیوں سے حضرت فاطمہؑ، حضرت علیؑ، امامِ حسنؑ اور امام حسینؑ کے کلامِ پاک کی کچھ مثالیں دی ہیں، پھر حورانِ جنت کے کلام اور امام حسینؑ کے کلماتِ صبر ومناجات سے متعلق کچھ بند نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''حق یہ ہے کہ جناب میر انیسؔ مرحوم مغفور نے ہر بند بلکہ ہر بیت بلکہ ہر مصرعہ میں دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے۔ جس قدر غوطے لگائیے نئے نئے گوہر آبدار نکالیے۔ جزاہ اللہ خیراً۔''

☆☆☆

حضرت رضاؔ مظہری مرحوم

خدائے سخن انیسؔ

(رباعیات)

پوری ہوئی تجھ سے آرزوے اردو
اب قلزمِ بیکراں ہے جوے اردو
اربابِ سخن کا قولِ محکم ہے انیسؔ!
ہے تیرا کلام آبروے اردو

☆

ثابت ہے ترے فن سے یہ فرمان ترا
ممکن نہیں نافہم سے عرفان ترا
بھولے گا زمانہ اسے کس طرح انیسؔ
نظمِ اردو پہ ہے جو احسان ترا

☆

ہر دَور میں نسلیں تاجِ فن دیں گی تجھے
فکریں شعرا کی باجِ فن دیں گی تجھے
فردوسی، کالی داس، ملٹن، ہومر
روحیں سب کی خراجِ فن دیں گی مجھے

ڈاکٹر سید عبداللہ

انیسؔ کا غم

میں جس زمانے میں میر تقی میرؔ کے المیہ مضامین کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اہل نظر میں سے کسی کی یہ رائے میری نظر سے گزری کہ میرؔ کا کلام گہرا ہے اس لیے کہ وہ خود روتے ہیں اور اگرچہ انیسؔ کے یہاں بھی الم ہے مگر ان کے غم کی حیثیت محض رلانے والے کی ہے۔ اور کہا کہ خود نہ روتے ہوئے محض دوسروں کو رلانے والا الم کی اس سطح کا ترجمان نہیں ہوتا، جس کی ترجمانی خود رونے والا کرتا ہے۔

بادی النظر میں یہ رائے قابل قبول ہی تھی، قبول کر لی گئی۔ لیکن تفکر کی وسعت اور مطالعہ کی گہرائی اس پر آہستہ آہستہ معترض ہوتی گئی اور اس نے اس نتیجہ پر پہنچایا کہ یہ رائے قابل بحث اور قابل ترمیم ہے۔ یہ رائے دراصل مرثیہ نگاری کے سرسری تصور کی وجہ سے قائم کی گئی ہے۔ چونکہ مرثیہ ایک مجلسی فن ہے اور اس کی غرض و غایت رلانا بھی ہے، اس لیے خیال کر لیا گیا کہ دوسروں کو رلانے والا، ہر حال میں رلانے ہی سے غرض رکھتا ہے۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ خود بھی روتا ہو۔

کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

اب اگر سچ مچ مرثیہ رلانے کا ہی فن ہے تو اس سے متعلق کئی دلچسپ سوال خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً:

(الف) کیا مرثیہ کسی المیہ احساس کے بغیر لکھا جا سکتا ہے؟

(ب) کیا مرثیہ، مرثیہ نگار کے اپنے احساسِ الم کا ترجمان نہیں؟

(ج) کیا مرثیہ نگار (مثلاً انیسؔ) کے کلام کی نوعیت اور اس کے الفاظ کے اندر بولنے والی شخصیت اپنے مزاج کا راز اپنی لفظیات اور اپنے کلام کے دوسرے حصوں میں آشکارا نہیں کر رہی؟

(د) کیا مرثیہ نگاری کی مجلس آرائی محض تفریحی مشغلہ ہے یا اس میں اس کے کاروبارِ الم کو بھی کچھ دخل ہے؟

یہ سب بحثیں فن مرثیہ کی ماہیت سے متعلق ہیں اور ان پر نامور اہل علم قلم اٹھا چکے ہیں لیکن ہنوز یہ معاملہ (کم از کم میری رائے میں) تشنۂ بحث ہے۔ یہ اس لیے کہ مذکورہ اہل علم حضرات کی ساری تنقید یا محاکمہ بعض مغربی اصناف کے معیاروں کے حوالے سے ہیں۔ مثلاً بعض ناقدین نے مرثیہ میں رزمیہ کی جستجو کی ہے۔ بعض نے اس پر ٹریجڈی کا سراغ لگایا ہے۔ بعض اور ہیں جو اسے محض بیانیہ کہہ کر، اس کو خطابت یا نری توصیف نگاری میں شامل کر رہے ہیں اور ایک حد یہ ہے کہ مرثیہ ایک فرقہ کی مذہبی شاعری ہے۔

یہ ساری پریشان خیالی اس لیے ہے کہ ہم اپنی اصنافِ سخن کو اپنی تہذیب، اپنی روحانی روایتوں سے جدا کر کے ان کی تعبیر مغربی روایتوں کے حوالے سے کرنے لگتے ہیں۔ صحیح موقف یہ ہے کہ مرثیہ صرف مرثیہ ہے اور مرثیہ لکھنے والا اصلاً غم اہل بیت کو ذاتی الم کا درجہ دے کر اس الم کی تشریح نگاری کرتا ہے۔ اس نوعیت کے آفاقی احساسِ الم کے بغیر مرثیہ لکھا ہی نہیں جا سکتا، بلکہ یہ کہنا بھی درست ہی ہوگا کہ اس نوعیت کے احساس کے بغیر مرثیہ نگار اپنے مرثیہ اہل مجلس کو سنا بھی نہیں سکتا، ورنہ ایک عام مرثیہ خواں ذاکر اور مرثیہ نگار سنانے والے کے درمیان کچھ بھی فرق نہ ہو۔

مرثیہ نگار محبت اہل بیت سے سرشار تو ہوتا ہے اور اس میں تمام محبانِ اہل بیت برابر کے شریک ہوتے ہیں، لیکن ہر محب اہل بیت مرثیہ نگار نہیں ہوتا............ سچی مرثیہ نگاری الم کے ذاتی احساس اور المیہ تجربے کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

اس سلسلہ میں کچھ غلط فہمی مرثیہ کی وصف نگاری اور خارجی جزئیات نگاری کی وجہ سے بھی پیدا ہوتی ہے لیکن بات سمجھ میں نہیں آتی کہ خارجی جزئیات نگاری سے الم کی نفی کیونکر ہوئی۔ الم تو مرثیہ کی نہاد میں ہے اور اچھے مرثیہ نگار اپنے المیہ احساس کی اس طرح تہذیب و تطہیر کر لیتے ہیں کہ وہ الم ایک تہذیب، ایک سلیقہ حیات بن جائے، اور اسے سلیقہ حیات بنانے کے لیے وہ اس میں ان عناصر کو بھی داخل کر دیتے ہیں جن کا ذکر انیس نے خود کیا ہے اور کہا ہے۔

دبدبہ بھی ہو، مصائب بھی ہوں، توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں، رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

اور بقولِ انیسؔ مرثیہ کا میدان ہر دوسرے میدان سے مختلف ہے۔

بزم کا رنگ جدا رزم کا میداں ہے جدا
یہ چمن اور ہے زخموں کا گلستاں ہے جدا

انیسؔ نے زخموں کا یہ گلستاں اگایا ہے مگر اس کو 'خون کی ہولی' نہیں بنایا۔ اسے سلیقہ مند مہذب آدمی کے لیے گوارا بھی بنایا ہے۔ اس میں صنعت بھی لائے ہیں، لب ولہجہ بھی ہے، متانت بھی ہے، روزمرہ بھی ہے، سلاست بھی ہے اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا دبدبہ اور توصیف بھی ہے۔ ان ساری باتوں کے باوجود مرثیہ کے ان عناصر ترکیبی میں یہ ایک عنصر کہ،

مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

اور مرثیہ تو ہے ہی کاروبارِ دردمندی اور ایک منفرد صنف، جس کی مثال دنیا کی کسی شاعری میں نہیں ہے —— یہ بات بنیادی اور مرکزی ہے کہ درد کی کہانی لکھنے والے کو پہلے خود دردمند بننا پڑتا ہے یا وہ دردمند ہوتا ہے۔ جو حضرات مرثیہ کو رزمیہ. یا المیہ کہتے ہیں وہ مرثیہ سے یوں بے انصافی کرتے ہیں کہ مرثیہ المیہ اور رزمیہ سے اپنی سرشت، مزاج اور غایت کے اعتبار سے (متضاد نہ بھی ہو تو بھی) مختلف صنف ضرور ہے۔

اب سوچنا یہ ہے کہ رزمیہ میں الم کی حیثیت کیا ہے؟ دنیا کے جتنے اہم رزمیے ہیں ان کے نصب العین اپنی بنیادی تحریک کے مطابق مختلف ہیں۔ کسی کا مقصد مذہب کی تقدیس و تمجید ہے، کسی کا مقصد وطن کی عظمت، کسی میں قوم کے عنفوان شباب میں، کسی نازک کشمکش موت وحیات میں، قومی احساسات کا پیکر بن جانے والا ہیرو مرکز ہوتا ہے اور اس کے بہادرانہ کارنامے موضوع توجہ ہوتے ہیں۔ کسی میں رومانٹک نصب العین ہوتا ہے۔ ان سب ضرورتوں میں رزمیہ، کسی المیہ صورت حال کی عکاسی کے باوجود مقصد کے لحاظ سے شجاعت اور ولولہ عمل کی۔ نہ کہ المیہ صورت حال کی ترجمانی کرتا ہے۔ رزمیہ کسی قوم کے اولین ادبی مظاہر میں نمودار ہوتا ہے اور معیاری مرثیہ نگاری، جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں،

شاعری کی منزلِ کمال میں چمکی۔

تو کہنا یہ ہے کہ مرثیہ میں درد اور رقت مرکزی عناصر ہیں اور رزمیہ میں جوش اور ولولہ انگیزی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

المیہ (ٹریجڈی) کے بارے میں بھی کچھ غلط فہمی ہے............ المیہ میں (اس میں شبہ نہیں کہ) المیہ احساس اور المیہ صورت حال دونوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے لیکن کشمکش کے جو تجربات ٹریجڈی کے لیے ثابت کیے جاتے ہیں وہ مرثیہ میں اگر تسلیم کر لیے جائیں تو مراثی کے رجال کی شان میں گستاخی سے کم نہیں اور مرثیہ کے مقصد سے سخت زیادتی ہے۔ المیہ نتیجہ کے بارے میں ارسطو نے ہیرو کی اتفاقی غلطی **(Hamartia)** کا جو تصور پیش کیا ہے اگر اسے اساس کار مانا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اہل بیت عموماً اور امام حسینؑ خصوصاً ایسی کسی غلطی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ ان کی شہادت تو ایک اولوالعزم انسان کے مجاہدانہ عزم کی آئینہ دار ہے اور اس میں اتفاقی غلطی کا کوئی پہلو نہیں...... نہ یہ مافوق الفطرت قوتوں سے مقابلہ تھا۔ یہ تو ایمان کا انکار سے مقابلہ تھا اور بالا رادہ تھا۔ حضرت امام حسینؑ کا عمل **(Hubis)** غرورِ نفس کی بناء پر بھی نہ تھا، بلکہ پورے اطمینانِ نفس کا آئینہ دار تھا۔

بعض جدید نقادوں نے ٹریجڈی میں متحارب قوتوں کی باہمی کشمکش کو خیر و شر کا محاربہ کہنے سے احتراز کرتے ہوئے اسے دو **(sublimes)** عظمتوں یا رفعتوں کا مقابلہ کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی اور جگہ یہ نظریہ ٹھیک بھی ہے تب بھی مرثیہ کی کشمکش المیہ میں یہ ایمان و انکار ہی کا مقابلہ تھا۔ دو رفعتوں کا مقابلہ نہ تھا۔

اس طویل تمہید کا مقصد یہ ہے کہ مرثیہ پر گفتگو کرنے والے ایپک اور ٹریجڈی کے چکر میں پھنس کر مرثیہ کی ماہیت کے بارے میں خبط مطلب کا مظاہرہ کرتے ہیں اور جب مرثیہ نگار کو المیہ نگار یا رزمیہ نگار سمجھ کر اسے اوروں کو رلانے والا قرار دیتے ہیں تو مرثیہ نگار کی بنیادی نفسیات اور بنیادی تحریک سے بے خبری کا ثبوت دیتے ہیں۔

یہ ساری بحث بعض اہل الرائے کے اس خیال کی تردید میں ہو رہی ہے کہ انیس خود نہیں روتے بلکہ اوروں کو رلاتے ہیں۔ تردید یہ ہے کہ انیسؔ اوروں کو رلانے سے پہلے خود بھی روتے ہیں ورنہ اتنے عالی مقام مرثیہ نگار کیسے ہوتے۔

انیسؔ غم کے ان تمام مدارج سے باخبر ہیں جو انسانوں کو مختلف حالتوں میں پیش آتے ہیں۔ بچے کا غم، ماں کا غم، بہن کا غم، بھائی کا غم۔ غرض غم کی ہزاروں صورتیں انیس کے کلام میں ہیں۔ ذاتی شعورِ غم کے سوا ان صورتوں کی توصیف کس طرح ممکن ہوسکتی ہے۔ وہ اپنا غم بھی جانتے ہیں اور دوسروں کے غم کی کیفیتوں سے بھی باخبر ہیں۔ انیسؔ، میرتقی میرؔ کی طرح صیغۂ واحد متکلم میں اس لیے فریاد کناں نہیں ہوئے کہ مرثیہ کا مخاطَب جدا ہے۔ یہ فن غیر شخصی ہے جس میں خارجی جزئیات کی فراوانی ہوتی ہے...... یہ دوسرے کے غم کی کہانی ہے۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ اس میں مرثیہ نگار کا ذاتی الم تہہ میں کام کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ مثال کے طور پر یہ ایک مرثیہ ہی دیکھیے جو 'بلبل ہوں بوستانِ شہِ تاجدار کا' سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی تمہید میں انیسؔ کے شخصی غم انگیز لہجہ کی پوری نمود ہے اور اس کے سوا کیا ثبوت مطلوب ہے کہ۔ 'گل چیں نسیم غم ہو، الم باغباں بنے'

پورا بند پڑھنا ہو تو پڑھیے:

آئے خزاں گلوں پہ تو ہو پھر بہارِ غم   تازہ ہوائے آہ سے ہوں برگ و بارِ غم
داغوں کے گل کھلیں تو گلوں میں ہوں خارِ غم   آنسو بہیں تو پھولے پھلے شاخسارِ غم

انیس کے کلام میں زخموں کے جو گلستاں کھلے ہیں وہ زخم اہل بیت کے بھی ہیں...... اگر ان کے پردے میں ان کے اپنے دل کے زخم بھی صاف نظر آتے ہیں...... ان کے سلام اور ان کی رباعیات وقطعات میں بھی یہ گلشن کھلے ہوئے ہیں اور مراثی کے بیانیہ وتوصیف و تمہیدات میں بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ میرتقی میرؔ روکر اوروں کو صرف رلانا ہی جانتے ہیں۔ انیسؔ روتے اور رلاتے بھی ہیں۔ مگر اس طرح کہ رونے والا 'محظوظ' بھی ہوسکتا ہے...... اور یہ حظ اس تہذیب غم سے پیدا ہوتا ہے جس نے انیس کے مرثیوں کو دنیا کی شاعری میں ایک منفرد اور برتر مقام عطا کیا ہے۔

(بشکریہ 'پیام عمل' لاہور جنوری، فروری ۔۱۹۷۳ء)

مقامِ انیس

قطعہ

نجم آفندی

جو اہلِ دل ہیں سمجھتے ہیں وہ مقامِ انیسؔ
یہ فنِّ مرثیہ گوئی میں اہتمامِ انیسؔ
حسینیت کی جو خدمت انیسؔ نے کی ہے
رہے گا تا بہ قیامت بلند نامِ انیسؔ

عمر انصاری

طور سینا بے کلیم اللہ منبر بے انیس

شاعر جو اک بلند نظر آپ ہیں انیس
ہستی گہر ہے، آب گہر آپ ہیں انیس
چرخِ ادب کے شمس و قمر آپ ہیں انیس
پردہ کشائے شام وسحر آپ ہیں انیس

کیا گفتگو ہو آپ سے عالی وقار سے
رکھوا کے لائے قطِ قلم ذوالفقار سے

ہم سب ہیں جس کے برگ وثمر وہ شجر ہیں آپ
کیا آپ سے چھپا ہے کہ صاحب نظر ہیں آپ
نازاں نہ کیوں ہنر ہو، کہ نازِ ہنر ہیں آپ
ہر اہلِ دل کی آبروئے چشمِ تر ہیں آپ

محفوظ ہو گیا وہ دلِ کائنات میں
جو لکھ دیا ڈبو کے قلم کو فرات میں

جو لفظ چھو لیا وہی لعل و گہر بنا
مضموں جو نظم کر دیا شیر و شکر بنا
نقطہ جہاں جو رکھ دیا شمس و قمر بنا
فقرہ جو چست کر دیا برق و شرر بنا

نوکِ قلم جدھر سے بھی پھر کر جدھر گئی
جو کھینچ دی لکیر دلوں میں اُتر گئی

فردوسیؔ ہوں، کہ شیکسپیرؔ ہوں، کہ کالیداسؔ
سب سے جُدا ہے آپ کے افکار کی اَساس
آزاد رَو وہ، آپ کو پابندیوں کا پاس
بھاری ہے داستانوں پہ اک حرفِ حق شناس
اُن کا ہے اور، آپ کا انداز اور ہے
اور کیوں نہ ہو، کہ اِس میں بھی اک راز اور ہے
ہر جملہ، کربلا کے علمدار کا وقار
ہر استعارہ، اصغرؑ معصوم کی پکار
تشبیہہ، جیسے بالی سکینہؑ کے دل کا پیار
ایک اِک کنایہ، عون و محمدؑ کی یادگار
گرمی ہر ایک بند میں خونِ حسینؑ کی
ہر بیت میں صدا وہی زینبؑ کے بین کی
کرتے ہیں کیا یہ لوگ اب اُردو زباں کی بات
وہ تو گئی بس آپ کے زورِ بیاں کے سات
کوزے میں بند کردئے دریا کے واقعات
صدیوں طویل ہو گئی اک کربلا کی رات
گو جَاوداں نہیں ہے، مگر جَاوداں سی ہے
ہر مختصر سی بات بھی اک داستاں سی ہے
چھیڑا جو دن کا ذکر تو دن جگمگا اٹھا
کی رات کی جو بات ستاروں نے دی صدا

گرمی کے تذکرے سے پسینہ اُبل پڑا
سردی کے نام ہی سے بدن تھر تھرا گیا
منظر وہی نگاہوں میں سب گھومنے لگا
آ آ کے گرم و سَرد، قلم چومنے لگا
شرما گیا قصیدہ بھی "چہرا" جو لکھ دیا
پہونچے گُریز تک تو سرِ نظم خم ملا
پہلو بَدل کے بخش دی پھر مثنوی کو جا
تکمیل تک تو سارا غزل ہی کا سَامزا
ہر گل جہاں ملے، وہ چمن مرثیے میں ہے
ہو کوئی بھی وہ صنفِ سخن مرثیے میں ہے
بیٹھے ذرا جو بزم میں گلشن کھلا دیئے
لاکھوں چراغ ایک نظر سے جلا دیئے
جنگ آپڑی تو کشتوں کے پشتے لگا دیئے
جس تیغ میں تھے جتنے بھی جوہر دکھا دیئے
بھرتا رہا طرارے قلم صورت فرس
جب تک، زمینِ شعر نہ خود کہہ اٹھی کہ بس

☆☆☆

سلام
(بہ زمینِ انیسؔ)

اڑا قبا کا جو دامن تو اک سحاب بنا
کبھی یہ ماہ کبھی نورِ ماہتاب بنا

تمہارے پرتوِ رُخ سے وہ چاندنی برسی
کہ ہر گلاب گلستاں میں ماہتاب بنا

صدائے حسن پہ ہر شاخ گنگنانے لگی
ہر اک درخت نیستاں میں اک رباب بنا

زمین لمسِ کفِ پا سے آسمان ہوئی
پڑے قدم تو ہر اک ذرہ آفتاب بنا

کرن لہو سے جو پھوٹی تو نورِ راہ بنی
ہر ایک قطرہ امامت کا آفتاب بنا

ہزار روپ تھے اے دوست خونِ ناحق کے
کہیں یہ [illegible] بنا اور کہیں گلاب بنا

ہر ایک بوند ترے خون کی صحیفہ بنی
ہر ایک ذرۂ خوں بستہ اک کتاب بنا

رگِ گلو سے جو ٹپکا وہ رائگاں نہ گیا
ہر ایک قطرۂ خوں موجِ انقلاب بنا

نہیں یہ فیض اگر منقبت کا تو کیا ہے
کہ لفظ لفظ مرا روحِ انقلاب بنا

سلام

(بہ زمین انیسؔ)

قدم قدم پہ ملک مجھ پہ بھیجتے ہیں سلام
رہِ فنا میں چلا لے کے میں حسین کا نام

خدا کا نام نہ لیتا کوئی زمانے میں
اگر نہ لیتے دمِ ذبح وہ خدا کا نام

بھلائے کیسے جنابِ انیسؔ کو وہ شخص
کرے جو ذکرِ امامِ حسینؑ عرش مقام

جواب مل نہ سکا شرق و غرب میں جس کا
جلائی مشعلِ خورشید صبح نے تا شام

حسینؑ حسینؑ کے نعروں سے دشت و دَر گونجے
کچھ اس خلوص سے اس نے لیا حسینؑ کا نام

وہ سوگوارِ شہیداں، غریقِ حبِّ حسینؑ
علی کی نسل، کا مدّاحِ اہلبیتِ عظام

امیرِ لفظ و معانی، فصیحِ سحر بیاں
زباں کنیز، مضامین اس کے گھر کے غلام

کسی سے نقل بھی اس کے کلام کی نہ بنی
وہ بے مثال سخنور وہ مرثیے کا امام

''قبولِ خاطرِ لطفِ سخن'' خدا کی ہے دین
ہے فیضِ آلِ نبی کا جسے ملے یہ مقام

انیسؔ تم بھی ہو مدّاحِ آل، میکشؔ بھی
سلام تم پہ، تمہاری طرف سے مجھ کو سلام

☆☆☆

سلام
(بہ زمین انیسؔ)

عیش کرتی تھی، سلامی، صفِ اعدا کیا کیا
اور تڑپا تھا محمدؐ کا نواسہ کیا کیا

رہے راضی برضا سید والا کیا کیا
دشت سے ورنہ اُبل سکتے تھے دریا کیا کیا

جب لکھا فردِ شہادت پہ حسین ابن علی
تو مشیت کا قلم ہاتھ میں کانپا کیا کیا

لے کے اصغر کو جو مقتل سے پھرے شاہِ امم
دل پہ گزرا ہے گراں پھول سا لاشہ کیا کیا

سجدۂ شکر الگ، ماتمِ ہر لحہ الگ
کام انجام دیے شاہ نے تنہا کیا کیا

قتل بیٹے بھی ہوئے بھائی بھتیجے بھی ہوئے
بنتِ حیدر نے مگر خود کو سنبھالا کیا کیا

تجھ کو اے کرب و بلا یاد رہے گا تا حشر
صبر اولادِ پیمبر نے دکھایا کیا کیا

خاک پر ایک بھی آنسو جو گرا دیتے حسین
حشر ہو جاتا پھر اس دہر میں برپا کیا کیا

قاسم و عون ومحمد سے جیالے نہ ملے
ڈھونڈ ھنے کو فلکِ پیر نے ڈھونڈا کیا کیا

شانِ حق گوئی و بے باکی وعزم و جرأت
ابنِ حیدر نے بڑھائی تنِ تنہا کیا کیا

نہ ملا حُر کے سوا حق کا طرف دار کوئی
فوج اعدا میں رہے یوں تو شناسا کیا کیا

کربلا والوں کا ایثار، کہ ہمت، کہ خلوص
دو ہی آنکھیں تھیں بھلا دیکھتی دنیا کیا کیا

سن سکا اتنا کہ نازشؔ بھی ہے مدّاحِ حسین
جانے دنیا نے اسے اور کہا تھا کیا کیا



سلام
(بہ زمین انیسؔ)

وہ در بدر ہوں، جو قبلہ نما نہیں رکھتے
وہ سب کو مانیں خدا، جو خدا نہیں رکھتے

ہم آپ ملتے ہیں بڑھ کر ہر ایک مشکل سے
انہیں ہو خوف جو مشکل کشا نہیں رکھتے

علی پہ ناز ہے ہم ایسے بے نیازوں کو
دماغِ شکوہ و دستِ دعا نہیں رکھتے

زماں مکاں ہیں اُنہی کے لیے اٹوٹ حصار
جو زورِ بازوئے قلعہ کشا نہیں رکھتے

خدائی بخشتے ہیں سائلوں کو فاقہ گزار
جو مال رکھتے ہیں، دستِ عطا نہیں رکھتے

سفر ہے ان پہ حرام، ان سے منزلیں بیزار
جو پاؤں شوقِ رہِ کربلا نہیں رکھتے

کرے تقاضا کسی سے بھی اب نہ ذبحِ عظیم
حسین قرض یہ کل پر اٹھا نہیں رکھتے

ٹپکنے میں بھی نہیں کھوتے آبرو آنسو
کہ ٹوٹنے میں یہ شیشے صدا نہیں رکھتے

مژہ سے چنتا ہے کوئی ان آفتابوں کو
خطر غروب کا اشکِ عزا نہیں رکھتے

زباں امیر، قلم زر نگار، دل صابر
علی کے بندے تصرف میں کیا نہیں رکھتے

☆☆☆

سیدہ فرحت
(علی گڑھ)

سلام
(بہ زمین انیسؔ)

یہ فکر آج بہت کم ہے ہم نشینوں کو
لگے نہ ٹھیس کہیں دل کے آبگینوں کو

کبھی جو باعثِ تہذیب نفس انساں تھے
زمانہ بھولتا جاتا ہے ان قرینوں کو

جو سطحِ آب پہ رقصاں ہیں کیا ملے گا انہیں
ملے ہیں جو دُر نایاب تہ نشینوں کو

نشانِ جادۂ ہستی جو ہیں زمانے میں
ڈبو سکا کوئی طوفان ان سفینوں کو؟

جنھوں نے دامنِ تاریخ مالا مال کیا
زمیں چھپائے ہے ایسے بھی کچھ دفینوں کو

حضورِ حق کے سوا خم کہیں ہو، ناممکن!
نہ ظلم و جبر جھکا پائے ان جبینوں کو

یہ سر کٹا کے زمانے میں سر بلند ہوئے
شرف ملا یہ محمد کے جانشینوں کو

وہ جن سے خاتمِ ایماں کو آب و تاب ملی
حسین لائے تھے چُن کر اُنہی نگینوں کو

یہ حسن و خیر کا آئینہ ہیں ستم گارو
ہدف بناتے ہو تیروں سے جن کے سینوں کو

وہ لاکھ عالم و فاضل سہی 'انیسؔ' مگر
دماغِ شعر کہاں تیرے نکتہ چینوں کو

زمیں پہ رہ کے جو تھے عرش آشیاں فرحتؔ
سلام نذر ہے ایسے بلند بینوں کو

☆☆☆

غـــزل

(درطرحِ انیسؔ)

یہ کس نے توڑ کے پھینکا ہے آبگینوں کو
ملا ہے ایک تماشا، تماشہ بینوں کو

ہمارے شہر میں ایسی بھی ایک رات آئی
ملی نہ بھیک اُجالوں کی مہ جبینوں کو

مکاں تو آج بھی موجود ہیں کھنڈر ہی سہی
مگر کہاں سے کوئی لائے اُن مکینوں کو

قدم جو چاند پہ رکھا تو یہ ہوا معلوم
کہ زندگی ابھی طے کر رہی ہے زینوں کو

ہمارے سر تو قلم ہو گئے مگر ہم نے
خدا کا شکر جھکایا نہیں جبینوں کو

سحر قریب ہے اب کون آنے والا ہے
بجھا دو شمع کو، پھینک آؤ آبگینوں کو

تمام شہر میں برپا ہے کیسا ہنگامہ
چڑھائے پھرتے ہیں کیوں لوگ آستینوں کو

ذرا مؤرخِ فردائے فکر و فن لکھ لے
کہ پتھروں سے خریدا گیا نگینوں کو

جو اعتبارِ نوا سنجی ہنر ہے شمیمؔ
تو نکتہ چینیاں کرنے دو نکتہ چینوں کو

غزل

(درطرح انیسؔ)

تلاش سجدوں سے کرتی ہیں جو خزینوں کو
میں دیکھتا ہوں تحیر سے ان جبینوں کو

کسی طرح یہ زمانے کی زد سے بچ نہ سکے
بچا یا لاکھ محبت کے آبگینوں کو

ہنر شناس گئے فن کے جوہری نہ رہے
کسے دکھاؤں خیالات کے نگینوں کو

حسینؑ ابنِ علی کا ہے نام پائندہ
زمانہ بھول گیا شمر سے لعینوں کو

ہمارا سینہ نظر آئے مرکز اسرار
دکھائیں کھود کے اک بار اگر دفینوں کو

بزعمِ خویش بڑے مدعی ہوئے لیکن
کوئی سمجھ نہ سکا عشق کے قرینوں کو

بہت ہوئے ہیں یہاں ماہرانِ گلشنِ راز
دکھا سکا نہ کوئی تہہ نشیں خزینوں کو

بنے ہوئے ہیں وہی داعیانِ امن جہاں
چڑھائے پھرتے ہیں ظالم جو آستینوں کو

جو فاش کردیں اشارے سے کائنات کا راز
زمانہ ڈھونڈتا ہے آج ان ذہینوں کو

ذرا انیسؔ کی جدت طرازیاں دیکھو
بلند جس نے کیا شعر کی زمینوں کو



غـــزل
(در طرحِ انیس)

دلوں سے اپنے کرو دور پہلے کینوں کو
جھکاؤ تب کہیں سجدوں میں تم جبینوں کو

یتیم جان کے موجوں نے جن کو پھینک دیا
بھنور میں ڈال دیا ہم نے ان سفینوں کو

شعاعِ ذات لٹکتی ہے جو صلیبوں پر
دعائیں دیتی ہے درد و الم کے زینوں کو

سنائی دیتی نہیں چاپ مجھ میں صدیوں سے
میں وہ کھنڈر ہوں ترستا ہے جو مکینوں کو

یہ سوچ کر کہ دھڑکتا ہے کرچیوں میں بھی دل
میں توڑ پھوڑ کے رکھ دوں گا آبگینوں کو

وہ ذات ہو کہ ہو فطرت، کہ دوسرا ہم جنس
جہادِ زیست میں کرتا ہوں زیر تینوں کو

جہاں ہے عشق، وہیں جلوہ گاہِ حسن بھی ہے
تجلیوں سے کرو طور اپنے سینوں کو

نشاطِ کرب کے لمحوں کا فیض جاری ہے
خبر کرو میرے شعروں کے نکتہ چینوں کو

طلسمِ لفظ و معانی کے نو بہ نو انبار
"ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو"

منظوم خراج عقیدت

علامہ عقیل الغروی

نذرِ انیسؔ

(رُباعیات)

دنیائے سخن میں ترا آوازہ ہے
خاطر کا ترے غبار بھی غازہ ہے
اے شاعرِ اعظم تری میراثِ سخن
سر چشمۂ فکر و ہنر تازہ ہے

الفاظ کو دنیائے معانی بخشی
کیا روح و روانِ آسمانی بخشی
ذکرِ شہدا کرکے انیسؔ خوش فکر
اردو کو حیاتِ جاودانی بخشی

ارضی کو روانِ آسمانی بخشی
تاثیرِ غم و دردِ نہانی بخشی
اربابِ مَعاجز کا بیاں کرکے انیسؔ
اردو کو بھی اعجاز بیانی بخشی

راقمؔ لکھنوی

رباعیات

(نذرِ انیسؔ)

دیکھی تری تخلیق کے شہ پارے میں
روح ید بیضا تھی ہر اک انگارے میں
برسوں مہ وانجم سے، مضامین انیسؔ
جھولے ترے افکار کے گہوارے میں

الفاظ نے شانِ کہکشاں پائی ہے
اظہار نے معراجِ بیاں پائی ہے
کیوں طاہرو اطہر نہ ہوں اشعار انیسؔ
کوثر میں ڈھلی ہوئی زباں پائی ہے

مضمون دقیق تر پر اظہار سلیس
ہر لفظ میں اعجاز ہر انداز نفیس
فن آکے یہاں مستند ہوتا ہے
معیار پر کھنے کی کسوٹی ہے انیسؔ

سلام

(بہ زمینِ انیس)

جہاں سے جب بھی مسافر کوئی روانہ ہوا
حقیقتاً وہ یہاں کے لیے فسانہ ہوا

کوئی اسیرِ ہوس بن کے اس جہاں میں جیا
کسی کے پاؤں کی زنجیر آب و دانہ ہوا

جسے غرور تھا طاقت کا اور دولت کا
تھے ہاتھ خالی وہ دنیا سے جب روانہ ہوا

جیو تو ایسے کہ مرنے کے بعد زندہ رہو
نہیں تو کیا ہے وجود بشر ہوا نہ ہوا

سلیقہ جینے کا یہ ہے کسی کے ہو رہیئے
یہ کوئی جینا ہے کہ بابِ دل ہی وا نہ ہوا

جلے چراغ تو بس اُن کے نام کا دل میں
وہ جن کی ذات سے پرنور خود زمانہ ہوا

حسین ابن علی جن پہ ہو درود و سلام
وہ نام جس کے سبب معتبر زمانہ ہوا

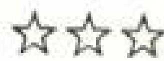
حسینیت سے جہاں فیض یاب آج بھی ہے
اگرچہ شہ کی شہادت کو ایک زمانہ ہوا

جواب ظلم و ستم تھا تبسم اصغر
جو ظالموں کے لیے ایک تازیانہ ہوا

وہ کربلا کا مؤذن شباب جس پہ نثار
بھری جوانی میں جو ظلم کا نشانہ ہوا

وقار کس سے ملا تشنگی کو دریا میں
وفا کا جس کے سبب معتبر فسانہ ہوا

مجھے نہ فکرِ جہاں ہے نہ عاقبت کا خوف
نظر نواز ترا جب سے آستانہ ہوا



راقمؔ لکھنوی

سلام

(بہ زمینِ انیسؔ)

سدا عروج کی دھن ہے بلند بینوں کو
ہم آسمان بنا دیتے ہیں زمینوں کو

جدارِ کعبہ نہ کیوں فاطمہ کو دیتی راہ
مکان ڈھونڈھ رہا تھا انہیں مکینوں کو

وہ اوج ہے نجف و کربلا و یثرب کو
سلام کرتے ہیں افلاک ان زمینوں کو

محاذ بدر سے تا کربلا رہے ناکام
مٹا رہے تھے جو اسلام کے قرینوں کو

حیات دیکھ کے جن کو درود پڑھتی تھی
حسینؑ لائے تھے اس شان کے حسینوں کو

انہیں پہ نیزہ و شمشیر اے مسلمانوں
ملا تے آئے جو صدرِ نبیؐ سے سینوں کو

فروغ دین کو بخشا حسینؑ والوں نے
زمینِ گرم پہ یوں رکھ دیا جبینوں کو

بطرزِ خاصِ مبارز طلب ہوے اصغر
چڑھا کے آئے ہیں جھولے سے آستینوں کو

نثار نکہت گل، جون کی قسم راقمؔ
گلاب اب بھی ترستے ہیں اُن پسینوں کو

پروفیسر مظفرؔ حنفی

سلام

کٹنے کے بعد بھی نہ جھکا سر حسینؑ کا
روشن ہوا نشان سنان پر حسینؑ کا

گرتے ہیں، گرد پھرتے ہیں گرادب و آبشار
صدقہ اُتارتے ہیں برابر حسینؑ کا

یہ جان کر بھی نہر سے خیمے ہٹا لیے
پانی کریں گے بند ستم گر حسینؑ کا

بوڑھے حبیب ابنِ مظاہر کے ساتھ ساتھ
اک شیر خوار بھی تھا دلاور حسینؑ کا

عون و محمد، اصغر و اکبر عطش عطش
مُرجھا گیا ہر ایک گلِ تر حسینؑ کا

باطل کے آگے اُس نے جھکایا کبھی نہ سر
عاشق ہے جان و دل سے مظفرؔ حسینؑ کا

سلام

(بہ زمینِ انیس)

سلام خدمتِ سرورؑ میں عاشقانہ ہوا — سخن کو شان ملی، شعر جاودانہ ہوا

(ق)

کیے مدارجِ تکمیل طے تو سرتاسر — خرد کا طرزِ تعقل بھی عاشقانہ ہوا
ہوے جو عشق میں پیدا کمال کے جوہر — تو اُس کا طرزِ تعامُل بھی عاقلانہ ہوا
یہ عقل و عشق کے مابین کیسی آویزش؟ — نہ رنگ و بو میں کبھی کوئی شاخسانہ ہوا!

بلندیوں نے قدم چومے بس اُسی کے جو — رکابِ وقت میں رکھ کر قدم روانہ ہوا
یہ راز سورۂ اسرا بتائے تو کس کو؟ — سفر حضور گا کس واسطے شبانہ ہوا
بیان سورۂ والنجم میں ہے یہ اجمال — کہ اس میں عقدۂ توسین بھی تو وا نہ ہوا
تردد اس میں کہ معراج تھی کہ خواب، ہے کفر — یہ اہتمام ضیافت کا معجزانہ ہوا
جہاں ٹھہر کے اجازت طلب فرشتہ ہو — جہاں میں صرف وہ زہرا کا آستانہ ہوا
سبھی تھے غرقِ تحیر بجز ابو طالب — جو تین روز تلک بابِ کعبہ وا نہ ہوا
شجاعتیں تھیں علیؑ کی برائے پیغمبرؐ — خود اپنے واسطے انداز صابرانہ ہوا
قیامت آگئی تھی مسکرا کے ٹال گیا — صغیرِ امام کا جب تیر کا نشانہ ہوا
عجب تھا وجد کا عالم حسینؑ پر طاری — اَدا جو سجدۂ تسلیم والہانہ ہوا
بیان اسیریِ اہلِ حرم کا ہو کیوں کر — کہاں ٹھکانہ ہوا کیسا آب ودانہ ہوا
پھر ہرا پرچمِ عباسؑ کا یہ لہرایا — کہ سر پہ سایۂ طوبیٰ کا شامیانہ ہوا
مراتب آلِ پیمبرؐ کے کس قدر ہیں بلند — مبالغہ نہ ذرا اس میں شاعرانہ ہوا
کرو معاصرو! طرزِ انیسؔ میں بھی سخن — ہمیں سُنے ہوے لہجہ وہ اِک زمانہ ہوا

بہشت ہو گئی اُس کی عقیلؔ بس جس کا
سلام خدمتِ سرورؑ میں عارفانہ ہوا

ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی، مسعودؔ ردولوی

سلام

(بہ زمین انیسؔ)

سو طرح کے غم میں بھی آنکھوں کو نم رکھتے نہیں — ہم جہادِ نفس میں پیچھے قدم رکھتے نہیں

کوششوں سے اپنی جتنا چاہا تجھ سے لے لیا — فاعلِ مختار فکرِ بیش و کم رکھتے نہیں

کہہ رہا ہے نوعِ انساں سے عملِ شبیرؑ کا — خوفِ باطل کا کبھی عالی ہمم رکھتے نہیں

مشعلِ راہِ ہدایت جب ہے کردارِ حسینؑ — کون سا حسنِ عمل ہوگا جو ہم رکھتے نہیں

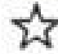
اشکِ غم کے آئینے میں سب خدائی دیکھ لی — عاشقِ شبیرؑ ذوقِ جامِ جم رکھتے نہیں

خوفِ دوزخ ہو انھیں اے نورِ چشمِ بوتراب — بہرِ سجدہ جو تری خاکِ قدم رکھتے نہیں

ہم تہی دستوں کی ہیں فیاضیاں ضرب المثل — مال و زر والے کبھی دستِ کرم رکھتے نہیں

دِل کی دنیا پر ہمیشہ سے ہے فضلِ کردگار — جز غمِ آلِ عبا ہم اور غم رکھتے نہیں

دیکھ لی مسعودؔ جب سے سیم و زر کی نارسی
دولتِ دُنیا نہ ہونے کا الم رکھتے نہیں



خود کو جو بحرِ غمِ شہ میں ڈبو سکتا نہیں — عمر بھر تر دامنی اپنی وہ دھو سکتا نہیں

کیا بھرے گا پیٹ بھوکوں کا شہنشاہِ جہاں — شب میں گر اُن کے لیے وہ جنس ڈھو سکتا نہیں

جس کے دل میں غنچۂ حُبِّ پیمبر کھِل گیا — وہ کسی کے قلب میں کانٹا چبھو سکتا نہیں

حق کوئی کیسے ادا کر پائے مدحِ شاہ کا — شعر کے ساغر میں یہ ساگر سمو سکتا نہیں

نذرِ شہ جو کر نہ پائے گوہرِ اشکِ عزا — سِلک میں کردار کے موتی پرو سکتا نہیں

جتنا دِل چاہے ذخیرہ کیجیے اعمالِ نیک — دونوں عالم میں کبھی یہ مال کھو سکتا نہیں

نیکیوں کے بیج دستِ دشمنِ آلِ نبیؐ — زندگی کے کھیت میں تا عمر بو سکتا نہیں

دل سے جب تک دردِ الفت کا نہیں اٹھتا سحاب — آنسوؤں سے کوئی دامن کو بھگو سکتا نہیں

بھول جائے حق کو، جادہ معرفت کا چھوڑ دے — عاشقِ شبیرؑ سے ہرگز یہ ہو سکتا نہیں

آنکھ مصنوعی ہے اُس کی اور دِل پتھر کا ہے — سُن کے حالِ سبطِ پیغمبر جو رو سکتا نہیں

خواب کے عالم میں ہے مسعودؔ جو بیدار بخت
وہ کبھی وقتِ نمازِ فجر سو سکتا نہیں

انتخاب کلامِ انیسؔ

اللہ کیا نمک ہے کلامِ انیسؔ میں   دشمن بھی گر پڑھے تو زباں پر مزا رہے



مینائے رقوماتِ ہُنر چاہیے اس کو   سودا ہے جواہر کا نظر چاہیے اس کو



لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار   خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو



اُٹھ گیا لو! شعرِ نو پڑھ کر انیسؔ   کیوں طبیعت کی روانی دیکھ لی



سُبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر   مگر ہم نے پلّہ گراں کر دیا



نظم ہے یا ہیں دُرِ شہوار کی لڑیاں انیسؔ   جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں



سدا ہے فکرِ ترقی بلند بینوں کو   ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

انتخابِ رباعیات

*"رُباعی ایسی صنف ہے جو تخیُّل کی بلندی اور بیان کی پختگی چاہتی ہے۔
اسی وجہ سے عموماً اِس کی طرف کم توجہ ہوتی ہے۔ یہ کہنا تو ٹھیک ہے کہ جیسے رباعیوں کے مجموعے فارسی میں ملتے ہیں، ایسے اور اتنے مجموعے اردو میں نہیں نظر آتے۔ لیکن کہنے والا یہ بھول جاتا ہے کہ فارسی اور اردو کی عمروں میں کتنا فرق ہے۔ پھر بھی اُردو نظم کا ذخیرہ رُباعی کے مجموعوں سے خالی نہیں۔ میر انیس نے بہت رباعیاں کہیں، اور ایسی کہیں کہ رُباعی کہنے کا حق ادا کیا۔ اُن کے ہاں اکثر چوتھا مصرع رُباعی کو چوتھے آسمان پر پہنچا دیتا ہے۔"

☆ آنجہانی علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی دیباچۂ طبعِ ثانی، رُباعیات محروم ص ۱۷

فلسفۂ حیات

آدم کو عجب خدا نے رُتبہ بخشا ادنیٰ کے لیے مقام اعلیٰ بخشا
عقل و ہُنر و تمیز و جان و ایماں اس ایک کفِ خاک کو کیا کیا بخشا

☆

ہم نے کبھی عصیاں سے کنارہ نہ کیا پر تُو نے دل آزردہ ہمارا نہ کیا
ہم نے تو جہنم کی بہت کی تدبیر لیکن تری رحمت نے گوارا نہ کیا

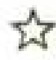
☆

پُتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تُو آنکھیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نور ہے تو
قُربت رگِ جاں سے اور پھر اس پر یہ بُعد اللہ اللہ کس قدر دُور ہے تو

☆

سائے سے بھی وحشت ہے وہ دیوانہ ہوں جو دام سے بھاگتا ہوں وہ دانہ ہوں
دیکھا نہیں جس کو اس کا عاشق ہوں انیسؔ جلتا ہے جو بے شمع وہ پروانہ ہوں

دولت کی ہوس ہے نہ طمع مال کی ہے　　خواہش منصب کی ہے نہ اقبال کی ہے
ہے ذات تری جواد و غفار غنی　　اُمید تجھی سے تیرے افضال کی ہے



نعت و منقبت

یا ختم رُسل مستِ مے اُلفت ہیں　　قدموں کی قسم کہ عاشق صورت ہیں
دیکھا جو حضور کو خدا کو دیکھا　　اس وجہ سے ہم بھی قائل رویت ہیں



دُنیا میں محمدؐ سا شہنشاہ نہیں　　کس راز سے خالق کے وہ آگاہ نہیں
باریک ہے ذکرِ قربِ معراج، انیسؔ　　خاموش کہ یاں سخن کو بھی راہ نہیں



کیا بھائیوں کے اُنس کا اندازہ ہے　　ہر وقت گُلِ عشق تر و تازہ ہے
یہ باب میں حیدرؑ کے نبیؐ کہتے ہیں　　میں شہر ہوں بازو مرا دروازہ ہے



ایک ایک قدم لغزشِ مستانہ ہے　　گلزار بہشت اپنا میخانہ ہے
سرمست ہیں حبِ ساقیِ کوثر سے　　آنکھیں شیشے ہیں قلب پیمانہ ہے



یکتا گہرِ قلزمِ سرمد ہے حسینؑ　　سردارِ اُمم مثلِ محمدؐ ہے حسینؑ
جب سر کو قدم کیا تو طے کی رہِ عشق　　حقا کہ شہیدوں میں سر آمد ہے حسینؑ



جس پر نظر اک لطف کی شبیرؑ کریں　　ادنا اعلا سب اس کی توقیر کریں
جس سنگ کو چاہیں وہ بنا دیں پارس　　جس خاک کو چاہیں ابھی اکسیر کریں



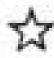
شہرہ ہر سُو جو خوش کلامی کا ہے　　باعث مدحِ امامِ نامی کا ہے
میں کیا، آواز کیسی، پڑھنا کیسا؟　　آقا، یہ شرف تیری غلامی کا ہے



انس و مَلک و حُور کی مجلس یہ ہے — تاجِ سرِ جمہور کی مجلس یہ ہے
ہوتی ہے گناہ کی سیاہی زائل — واللہ عجب نور کی مجلس یہ ہے



عابد سب ہیں، خدا رسیدہ سب ہیں — بینا صفتِ مردمِ دیدہ سب ہیں
گلزار ہے لکھنؤ انھیں پھولوں سے — چیدہ مجلس ہے برگزیدہ سب ہیں



رثائی رباعیاں

خوں میں شہِ مظلوم کا سینہ ڈوبا — بطحا ہوا برباد، مدینہ ڈوبا
کیا بیٹھے ہو سر پہ خاک اُڑاؤ، یارو — خشکی میں محمد کا سفینہ ڈوبا



نیساں کو خجل دیدۂ تر سے پایا — دامن کو بھرا ہوا گہر سے پایا
یہ لطف اُٹھایا نہ کسی شادی میں — جو حظ غمِ شاہِ بحر و بر سے پایا

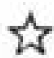


فخریہ

بے جا نہیں مدحِ شہ میں غرّا میرا — بھرتی سے کلام ہے معرّا میرا
مرغانِ خوش الحانِ چمن بولیں کیا — مرجاتے ہیں سُن کے روزمرّا میرا



گلہائے مضامیں کو کہاں بند کروں — خوشبو نہیں چھپنے کی جہاں بند کروں
میں باعثِ نغمہ سنجیِ بلبل ہوں — کھولے نہ کبھی مُنہ جو زباں بند کروں



منبر سے ہم اُترے نئے مضموں پڑھ کر — ان کے لیے گویا منّ و سلوا اُترا
مضمونِ انیس کا نہ چربا اُترا — اُترا بھی تو کچھ بگڑ کے نقشا اُترا



اخلاقی رباعیاں

لالے سے عیاں بہارِ سرجوشی ہے نرگس کو جو دیکھیے تو مدہوشی ہے
کیسی یہ گومگو ہے اے ربِّ کلیم بلبل نالاں ہے، گُل کو خاموشی ہے

☆

آنکھیں کھولیں مگر یہ پردا نہ کھلا سب ہم پہ کھلا پہ حالِ دُنیا نہ کھلا
دریائے تفکّر میں رہے برسوں غرق مانندِ حباب یہ معمّا نہ کھلا

☆

پُرساں کوئی کب جوہرِ ذاتی کا ہے ہر گُل کو گِلہ کم التفاتی کا ہے
شبنم سے جو وجہِ گریہ پوچھی تو کہا رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے

☆

جو شے ہے فنا اسے بقا سمجھا ہے جو چیز ہے کم اُسے سوا سمجھا ہے
ہے بحرِ جہاں میں عمر مانندِ حباب غافل اس زندگی کو کیا سمجھا ہے؟

☆

دل سے طاقت بدن سے کَس جاتا ہے آتا نہیں پھر کر جو نفس جاتا ہے
جب سال گرہ ہوئی تو عقدہ یہ کھلا یاں اور گرہ سے اک برس جاتا ہے

☆

دولت کی نہ خواہش ہے، نہ زر چاہتے ہیں نے مال نہ اسباب نہ گھر چاہتے ہیں
جو مزرعِ آخرت ہے وہ خشک نہ ہو ہاں اک تری رحمت کی نظر چاہتے ہیں

☆

اندیشۂ باطل سحر و شام کیا عقبیٰ کا نہ کچھ ہائے سرانجام کیا
ناکام چلے جہاں سے افسوس انیسؔ کس کام کو یاں آئے تھے کیا کام کیا

☆

کھینچے ہوئے سر کو تو کہاں پھرتا ہے؟ پیری میں بشکلِ نوجواں پھرتا ہے
عرصہ ہے جہاں کا اس قدر تنگ و حقیر خم ہو کے زمیں پہ آسماں پھرتا ہے



مانا ہم نے کہ عیب سے پاک ہے تو مغرور نہ ہو، صاحبِ ادراک ہے تو
بالفرض گر آسماں پہ ہے تیرا مقام انجام کو سوچ لے کہ پھر خاک ہے تو



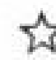
جو سوخرمن سے خوشہ چیں ہوتا ہے دانائے جہاں وہ نکتہ بیں ہوتا ہے
ملتا نہیں نامِ نیک بے کاہشِ جاں کٹتا ہے عقیق تب نگیں ہوتا ہے



مال و زر و افسرِ حشم ملتا ہے ممکن ہے نگیں، طبل و علم ملتا ہے
عنقا، گوگرد، سرخ پارس، اکسیر یہ سب ملتے ہیں دوست کم ملتا ہے



اُلفت ہے، نہ پاسِ ربطِ دیرینہ ہے مُنہ پر تو ہیں صاف، قلب میں کینہ ہے
گر کیجیے امتحاں تو قلعی کُھل جائے یاں سب کے دلوں کا حال آئینہ ہے



افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے اس باغ سے کیا کیا گُلِ رعنا نہ گئے
تھا کون سا نخل جس نے دیکھی نہ خزاں وہ کون سے گُل کِھلے جو مُرجھا نہ گئے



وہ تخت کدھر ہیں اور کہاں تاج ہیں وہ؟ جو اوج پہ تھے زیرِ زمیں آج ہیں وہ
قرآں لکھ لکھ کے وقف جو کرتے تھے اک سورۂ الحمد کے محتاج ہیں وہ

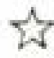


مرمر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے　　رُخ سب سے پھرا کے مُنہ دکھایا ہے تجھے
کیونکر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر　　میں نے بھی تو جان دے کے پایا ہے تجھے



ذاتی

لفظوں میں نمک، سخن میں شیرینی ہے　　دعوائے ہنر، نہ عیب خود بینی ہے
مدّاحِ گُلِ گلشنِ زہراؓ ہوں میں　　غنچے کی طرح زباں میں رنگینی ہے



اندازِ سخن تم جو ہمارے سمجھو　　جو لطفِ کلام ہیں وہ سارے سمجھو
آواز گرفتہ گر ہے اس ذاکر کی　　پہروں روؤ اگر اشارے سمجھو

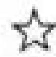


میر انیس

انتخابِ سلام

اُسی کا نُور ہر اک شے میں جلوہ گر دیکھا ۔۔۔ اُسی کی شان نظر آ گئی جدھر دیکھا
علیؑ کو حق نے اُتارا تو عین کعبہ میں ۔۔۔ کھلی جو آنکھ تو پہلے خدا کا گھر دیکھا
قیام کس کا ہُوا اِس سرائے فانی میں ۔۔۔ ہمیشہ ایک کے بعد ایک کا سفر دیکھا
مثالِ شاخ جھکے جب تو ہم پھلے پھولے ۔۔۔ نہالِ عجز لگا کر عجب ثمر دیکھا
یقیں ہُوا اسے، ہے آفتاب پہ شبنم ۔۔۔ رُخِ حسینؑ کو جس نے عرق میں تر دیکھا
خوشا رواقِ علَم دار و روضۂ شبّیر! ۔۔۔ خدا کے نور کا جلوہ اِدھر اُدھر دیکھا
پڑا جو عکسِ رُخِ شاہ چرخ پر سرِ شام ۔۔۔ فلک نے صبح تک آئینۂ قمر دیکھا

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیسؔ
عروجِ مہر بھی دیکھا تو دو پہر دیکھا



اِک نہ اک نیرنگ ہوتا ہی رہا ۔۔۔ پر سلامی شہ پہ روتا ہی رہا
جس نے چاہا خاک سے موتی اُگیں ۔۔۔ وہ یہ تخمِ اشک بوتا ہی رہا
جس نے دیکھی سبحۂ پاکِ حسینؑ ۔۔۔ اشک پلکوں میں پروتا ہی رہا
لختِ دل باقی ہیں، اے اہلِ عزا! ۔۔۔ تُو فقط موتی پروتا ہی رہا
کس میں ہے گنجائشِ فیضِ حسینؑ! ۔۔۔ آسماں کو عذر کوتا ہی رہا!!
دل میں بانو کے سدا اکبرؑ کا غم ۔۔۔ نوک برچھی کی چُبھوتا ہی رہا

قافلہ منزل پہ جا پہنچا انیسؔ
بے خبر، اب تک تُو سوتا ہی رہا



بیکسی کا شہ کی چرچا رہ گیا　　مُجرئی ! مہمان پیاسا رہ گیا

(ق)

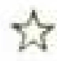
دیر آئے، پر بہ جلد آئے رسولؐ　　دور لاکھوں کوس سایا رہ گیا
اللہ اللہ، قربِ معراجِ رسولؐ　　دو کماں سے فرق ادنیٰ رہ گیا
اٹھ گئے مابین سے سارے حجاب　　بس، فقط، آنکھوں کا پردا رہ گیا
سب ہوئے سیراب تجھ سے اے فرات　　قافلہ یثرب کا پیاسا رہ گیا
ڈگمگا کر جب گرے گھوڑے سے شاہ　　کانپ کر عرشِ معلاّ رہ گیا

سوؤ گے کب تک بس اب اُٹھو انیسؔ
دن بہت غفلت میں تھوڑا رہ گیا



پڑا جو عکس تو ذرّہ بھی آفتاب بنا　　خدا کے نُور سے جسمِ ابوتراب بنا
بنائے روضۂ سرور جو کربلا میں ہوئی　　مَلَک پکارے کہ اب خُلد کا جواب بنا
جو آبرو کا ہے طالب تو کر عرق ریزی　　یہ کش مکش ہوئی تب پھول سے گلاب بنا
یہ مشتعل ہوئی سینے میں آتشِ غمِ شاہ　　کہ آہ سیخ بنی اور جگر کباب بنا
ہوا یہ کیوں ہیں تنک مایگانِ بحرِ فنا　　جو بڑھ گیا کوئی قطرہ تو وہ حباب بنا
فلک پہ نالۂ سوزاں نے آگ بھڑکائی　　دُھواں جو آہ کا نکلا مری، سحاب بنا

ترے سلام میں ہے مرثیے کا سارا لطف
انیسؔ نظمِ غمِ شہ میں اک کتاب بنا



علیؑ ابھی نہ کوئی عادلِ زمانہ ہُوا　　کہ ایک بازو کبوتر کا آشیانہ ہُوا
سیاہ دیدۂ شبیرؑ میں زمانہ ہُوا　　ہوائے ظلم سے جب گل چراغِ خانہ ہُوا
شباب تھا کہ دمِ واپسیں کی آمد شد　　یہ مضطرب اِدھر آیا، اُدھر روانہ ہُوا
اندھیری قبر تھی اور میں تھا یا علیِ ولی!　　حضور آئے تو روشن سیاہ خانہ ہُوا

سحاب سائے میں رکھتا تھا جس کے نانا کو — لحد کو اس کی میسّر نہ شامیانہ ہُوا
وہ زلف، چوبِ سناں ہیں بندھی ہزار افسوس — نبیؐ کے پنجۂ مژگاں سے جس میں شانہ ہُوا
بھٹک کے راہ سے پیچھے کہیں نہ رہ جاؤ — انھو انیسؔ اٹھو، کارواں روانہ ہُوا

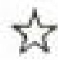


غمِ شہ کا جس نے بیاں کر دیا — اِن آنکھوں نے دریا رواں کر دیا
گھٹا زور، مشقِ سُخن بڑھ گئی — ضعیفی نے ہم کو جواں کر دیا



سُبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر — مگر ہم نے پلّہ گراں کر دیا
مری قدر کر، اے زمینِ سُخن! — تجھے بات میں آسماں کر دیا
نہ دیکھی گئی شہ سے اصغرؑ کی لاش — زمیں میں پسر کو نہاں کر دیا
لکھی شہ کے خالِ معنبر کی مدح — قلم نے ہمیں نکتہ داں کر دیا

نواسنجیوں نے تری اے انیسؔ
ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا



گزر گئے تھے کئی دن کہ گھر میں آب نہ تھا — مگر حسینؑ سے صابر کو اضطراب نہ تھا
نہ جانے برق کی چشمک تھی یا شرر کی لپک — ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا
حسینؑ اور طلبِ آب اے معاذ اللہ — تمام کرتے تھے حجّت، سوالِ آب نہ تھا
ہر اک کے ساتھ ہے روشن دِلوں طلوع و غروب — سحر کو چاند نہ تھا، شب کو آفتاب نہ تھا
ثمر شجر کو دیا، گل کو زر، صدف کو گہر — وہ کون تھا کہ علیؑ سے جو فیض یاب نہ تھا؟

انیسؔ عمر بسر کر دو خاکساری میں
کہیں نہ یہ کہ غلامِ ابوتراب نہ تھا



گھر سے جب زوّار دو منزل گیا — مجرئی! جنّت کا رستہ مل گیا
کیا شہادت کی خوشی تھی شاہ کو — زخم جو کھایا بدن پر کھِل گیا

ق

شہسوارِ دوشِ احمدؐ کا پسر — قید میں پیدل کئی منزل گیا
بیڑیوں سے پنڈلیاں زخمی ہوئیں — طوق سے نازک گلا چِھل چِھل گیا
قہرِ حق تھا غیظ عباسِ علیؑ — شیر کے نعروں سے جنگل ہل گیا
شکر اللہ تخت پر بیٹھے علیؑ — جلوہ فرما حق ہوا دل کِھل گیا
پنجتن کا واسطہ دے کر انیسؔ
جو خدا سے تم نے مانگا مل گیا



لحد میں سامنے جب دفترِ حساب آیا — گناہ دیکھ کے کیا کیا مجھے حجاب آیا
رُخِ حسینؑ سے میں نے کبھی نہ دی تشبیہ — چمک کے سامنے سو بار آفتاب آیا
زمیں کا زور چلا خاک بھی نہ وقتِ فشار — مری زباں پہ جو نامِ ابوترابؑ آیا
جب آفتاب میں نکلے محمدؐ عربی — تو چتر بن کے سرِ پاک پر سحاب آیا
ظہورِ نورِ محمدؐ ہوا خلیلؑ کے بعد — چھپا جو چاند، زمانے میں آفتاب آیا
غمِ حسینؑ میں جب آہ کی تو برسے اشک — اِدھر چمک گئی بجلی، اُدھر سحاب آیا
حسینؑ و حُرؓ کی ملاقات تھی کہ عالمِ نور — اُدھر سے ماہ بڑھا تھا کہ آفتاب آیا
اٹھائے شہ نے کلیجے پہ جب بہتر داغ — تو سیّد الشہدا، عرش سے خطاب آیا
کوئی بھی سوتا ہے پیری میں اس طرح غافل
اٹھو، انیسؔ اٹھو، سر پہ آفتاب آیا



خضرؑ قرباں ہیں سلوکِ حیدرِؑ ذی جاہ پر — پھر نہ بھٹکا وہ، جسے لائے خدا کی راہ پر
نقشِ پائے شاہ سے تشبیہ دیتے ہم ضرور — گر نہ ہوتا جھائیوں کا عیب روئے ماہ پر
فقر کی نعمت کا میں بھوکا ہوں یا مشکل کشا — آپ کشکولِ گدا بھر دیں خدا کی راہ پر
دولت اِس کو دی قناعت کی تو اُس کو زر دیا — لطف اُس عادل کا یکساں ہے گدا و شاہ پر

ابروؤں پر شہ کی کیا زیبا ہے نورانی جبیں　　خوشنما ہے لوح ہر سورے میں بسم اللہ پر
حُبِّ حیدرؑ چاہیے کیسی خطا، کیسے گناہ　　بخش دینا جُرم کیا دشوار ہے اللہ پر
فکر کا ہے کی ہے کیا دنیا سے جاؤ گے انیسؔ
اپنا توشہ لے کے دسترخوانِ شاہنشاہ پر؟



خوشا زمینِ معلّٰی، زہے فضائے نجف　　ریاضِ خلد بھی ہے شائقِ ہوائے نجف
مریض کے لیے اکسیر ہیں یہ دو نسخے　　غبارِ مرقدِ شبیرؑ اور ہوائے نجف
وہاں قدم کا ہے کیا کام، اے ادب، توبہ　　سروں سے چلنے کے قابل ہیں کوچہ ہائے نجف
جسے بہشت میں آنا ہو، آئے وہ مجھ تک　　ہر اک دیار میں آتی ہے یہ صدائے نجف
اِدھر سے کوششِ کامل ہے، اُس طرف سے کشش
انیسؔ ہم نہ رہیں گے کہیں، سوائے نجف



السلام اے لحدِ اقدس و اعلائے حُسینؑ　　مہبطِ نورِ خدا، طورِ تجلّائے حُسینؑ
یہی بخشش کا وسیلہ ہے، یہی راہِ نجات　　فرض ہے اُمتِ احمدؐ پہ تولّائے حسینؑ
کون سی چشم ہے، جاری نہیں جس سے آنسو　　کونسا دل ہے، کہ جس دل میں نہیں جائے حسینؑ
رفقا کہتے تھے، رکھ دیں ابھی تیغوں پہ گلے　　حکمِ خالق ہے ہمارے لیے ایمائے حسینؑ
ق
اپنی آغوش میں رکھتے تھے محمدؐ دن بھر　　سینۂ فاطمہؑ پر رات کو تھی جائے حسینؑ
مختصر حال یہ بچپن کا ہے، پر قتل کے بعد　　رہ گیا دھوپ میں عریاں تنِ زیبائے حسینؑ



سر دیا، اور نہ دیا ہاتھ میں میخوار کے ہاتھ　　واہ کیا فہم تھی، کیا عقل تھی، کیا رائے حسینؑ
حق کے محبوب نبیؐ ہیں، یہ نبیؐ کے محبوب　　پوچھے احمدؐ سے کوئی، رتبۂ اعلائے حسینؑ
ہند میں ہوں، یہ شب و روز دعا ہے یہ انیسؔ
قبر ہو متصل قبرِ معلّائے حسینؑ



جس دم نمازِ صبح ادا کی حسینؑ نے

درج ذیل منتخبہ بند 'انیس۔ ۳۳ غیر مطبوعہ مرثیے' مطبوعہ مرکزی انیس صدی کمیٹی ۱۹۹۰ء میں شامل مرثیے سے نقل کیے جا رہے ہیں۔ یہ مرثیے شہاب سرمدی مرحوم نے مختلف مصادر سے تحقیق کر کے میر انیس کے تسلیم کیے تھے اور انھیں پہلی بار شائع کیا تھا۔ ان کی تحقیق کے مطابق ان میں سے بیشتر مرثیے میر انیس کے فیض آباد قیام کے دوران نظم ہوئے تھے۔ زیرِ نظر مرثیہ ۱۰۸ بندوں پر مشتمل ہے اور شہاب سرمدی کے اپنے الفاظ میں، ''...... اس کے اجزائے ترکیبی میں...... منظر نگاری کے طور طریق یا مدح وثناء، نعت ومنقبت، ذکر خود اور ربط وگریز کے انداز؛ اور انھیں کے ساتھ میر انیس کی وہ نادرہ کاری یعنی رزم و بزم کو یکجا کر دینا اس کا تیہہ، یہ سب بھی نقوشِ اولین کی صورت، ان مرثیوں میں پائے جاتے ہیں۔'' (مقدمہ ص ۳۸)

چونکہ زیرِ نظر مرثیہ معروف ہے اور ابھی صرف دس بارہ سال قبل منظر عام پر آیا ہے، اس لیے اس کے کچھ بند شامل کیے جا رہے ہیں۔ مکمل مرثیہ محولہ کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ (مرتب)

جس دم نمازِ صبح ادا کی حسینؑ نے دل سے رجوع سوے خدا کی حسینؑ نے
نہوڑا کے فرقِ پاک بکا کی حسینؑ نے بخشش کی مومنوں کی دعا کی حسینؑ نے
آئی صداے غیب کچھ ایسی کہ رک گئے
ہنس کر امام خاک پہ سجدے کو جھک گئے

کچھ دیر تک تو خم رہے شاہ فلک مقام پھر سر اٹھا کے بولے رفیقوں سے یہ امام
لاؤ تبرکاتِ پیمبرؐ باحترام حاضر جو اسلحہ کی ہوئیں کشتیاں تمام

جلدی امام جن و بشر اٹھ کھڑے ہوئے
مرنے پہ باندھنے کو کمر اٹھ کھڑے ہوئے

آئے مصافحہ کے لیے سب رفیق شاہ   حضرت نے ایک ایک پہ حسرت سے کی نگاہ
ہاتھوں پہ آنکھیں مل کے ہٹے جب وہ رشک ماہ   سب نے پڑھی زیارتِ پیغمبرؐ الہٰ
تھے جو عزیز و غیر وہ آنسو بہاتے تھے
فقروں کو پڑھ کے سبط نبی روتے جاتے تھے

پڑھتے تھے شہ زیارتِ سلطانِ نامور   آمادہ جنگ پر جو ہوئی فوجِ کیں ادھر
اک تیر ابن سعد نے چلّہ میں جوڑ کر   پھینکا سوے خیامِ شہنشاہِ بحر و بر
سب بیبیوں کے رنگ اڑے، دل اچھل پڑے
نزدیک تھا کہ خیمہ سے فضہ نکل پڑے

خیمہ میں تہلکہ ہوا گھبرائیں بیبیاں   اکبر کو یوں پکاریں خواصیں بصد فغاں
شہزادے! خیر سے تو ہیں سلطانِ انس و جاں   کہہ دو کہ حالِ بنتِ علی غیر ہے یہاں
بچے بلک رہے ہیں ہر اک کو ہراس ہے
زینب تو سارے گھر سے سوا بے حواس ہے

یہ سن کے شہ چلے جو سوے خیمۂ حرم   ڈیوڑھی تلک تھے ساتھ رفیقانِ محتشم
پردہ اٹھایا بازوے شہ نے بچشم نم   داخل حرم سرا میں ہوئے سید امم
جو بی بی سامنے تھی ادب سے وہ ہٹ گئی
دامن پکڑ کے شہ سے سکینہ لپٹ گئی

غش میں سنی جو بھائی کی ہمشیر نے صدا   بس یا حسینؑ کہہ کے اٹھی بنت مرتضیٰ
سر اپنا پائے سید بیکس پہ رکھ دیا   اور دونوں ہاتھ جوڑ کے یہ شاہ سے کہا
رکھے خدا ہمیں شہ دیں کی پناہ میں
لو رَن سے تیر آتے ہیں اب خیمہ گاہ میں

پانی کے بند کرنے پہ مارا نہ ہم نے دم   دعوت یہ کس طرح کی ہے یا سید امم
لشکر اُدھر کثیر ادھر ہے سپاہ کم   برباد ہوں گے کیا اسی جنگل میں آج ہم

گھر لوٹ لیں گے قبلۂ عالم پناہ کا
مجھ سے تو کہیے کیا ہے ارادہ سپاہ کا

شہ نے گلے لگا کے یہ ہمشیر سے کہا یہ وقتِ صبر و شکر ہے، اے بنت مرتضیٰ
جو حق کا حکم بندۂ عاجز کا زور کیا بھینا یہی تو روز ہے بھائی کے قتل کا
پیغامِ جنگ اُدھر سے یہ سب تیر لائے ہیں
خیمہ میں ہم جو آئے تو رخصت کو آئے ہیں

کہنے لگی حسینؑ سے رو کر وہ نوحہ گر بھیا، بہن کا ساتھ ہی اترے گا تن سے سر
کیا میری زندگی، جو لٹا فاطمہ کا گھر اچھا مجھے بھی قتل کریں آج اہل شر
سر ہو بہن کا ساتھ شہ مشرقین کے
مجھ کو فدا کریں یہ قدم پر حسینؑ کے

بولے حسینؑ اب نہ کرو نالہ و بکا صدقہ نبیؐ کی روح کا، بھیا کو دو رضا
اماں نے اس جہاں میں نہ کیا کیا ستم سہا دنیا مقامِ ہجر ہے، اے بنت مرتضیٰ
بلبل کے آگے باغ سے گل ٹوٹ جاتے ہیں
برسوں بہم جو رہتے ہیں وہ، چھوٹ جاتے ہیں

لو الوداع، جاتا ہے شبیر، الوداع سر پر اجل ہے بھائی کے ہمشیر، الوداع
بچنے کے اب نہیں کسی تدبیر، الوداع سونپا خدا کو بانوے دل گیر، الوداع
منہ آنسوؤں سے بچوں کو دھونے نہ دیجیو!
میری سکینہ جان کو رونے نہ دیجیو!

بولی لپٹ کے شہ سے سکینہ جگر فگار کیوں میری سعی کرتے ہو اماں سے بار بار
دنیا سے ہے اگر سفر شاہِ نامدار ہمراہ لو کنیز کو بھی تم پہ میں نثار
گرمی کے دکھ نہ پیاس کی زحمت اٹھائیں گے
دادی کے پاس خلد میں اب ہم بھی جائیں گے

مجھ کو یہاں نہ چھوڑیے اچھے مرے پدر میں بھی چلوں گی جائیں گے سبط نبی جدھر
دامن چھڑاؤ گے تو میں پیٹوں گی اپنا سر پھر میں نہ بولوں گی جو سدھارو گے بے خبر

انگلی ہو آپ کی، مرا ننھا سا ہاتھ ہو
جائیں جہاں امام، یہ بیٹی بھی ساتھ ہو

بولے حسین اب پھوپی اماں کے پاس جاؤ   یہ پیاری باتیں کرکے نہ شبیر کو رلاؤ
بلوائے گا تمہیں بھی وہیں باپ غم نہ کھاؤ   لپٹا لیں پھر گلے سے تمہیں ایک بار آؤ
بی بی یہ اضطراب بھلا کیا ضرور ہے
جاتے ہیں ہم جہاں وہ جگہ یاں سے دور ہے

فرما کے درد و یاس کے بیٹی سے یہ کلام   گودی سے بس اتار کے باہر چلے امام
ڈیوڑھی تلک تھا بیبیوں کا ساتھ ازدہام   روتے تھے اہلِ بیتِ رسولِ فلک مقام
تھا کوچ اس جہان سے زہرا کے جائے کا
جاتا تھا آسمان پہ غل ہائے ہائے کا

جس وقت در سے خیمہ کے نکلے امامِ دیں   جلوے سے آفتاب کے روشن ہوئی زمیں
ڈیوڑھی سے نور پھیل گیا تا بہ دشتِ کیں   غل تھا کہ آج دشت ہوا چرخ چار میں
قرباں ہیں جنّ و انس و ملک شہ کی شان پر
جاتی ہے نورِ رخ کی ضیا آسمان پر

کیوں کر نہ ہو حسینؑ کو دنیا پہ برتری   سر پر اسی دلیر کے ہے تاجِ افسری
پیدا ہے رعب و جاہ سے شانِ غضنفری   قبضے میں ہے ہنر بر کے شمشیرِ حیدری
داؤد کی زرہ، شہ عالم کے بر میں ہے
پٹکا محمدؐ عربی کا کمر میں ہے

گھوڑے پہ جلوہ گر ہوئے جس دم امامِ دیں   کس شان سے جلو میں چلے سب وہ مہ جبیں
مرکب پری، ملک تھے سوارانِ نازنیں   ٹاپوں سے راہوار کے ہلنے لگی زمیں
قلت پہ فوج کی علی اکبر نے رو دیا
سج دھج ہر اک کی دیکھ کے سرور نے رو دیا

آتے تھے اس شکوہ سے سلطانِ خاص و عام   عباسِ نامدار تھے مصروفِ اہتمام
جب سوئے فوج دیکھتے تھے شاہِ تشنہ کام   جوں غنچہ مسکراتا تھا ہر ایک لالہ فام

اک ایک مستعد نظر آتا تھا جنگ پر
سرخی تھی گل کی طرح سعیدوں کے رنگ پر

لشکر ہے یہ کہ بادِ بہاری ہے غازیو! بوے بہشت دشت میں ساری ہے، غازیو!
زہرا نے یہ زمین بُہاری ہے، غازیو! مولا کی آخری یہ سواری ہے، غازیو!
آنکھوں کے آگے گلشنِ جنت کی کشت ہے
دیکھو وہ سلسبیل ہے اور وہ بہشت ہے

جی بھر کے آج دیکھ لو صورت حسینؑ کی ہے مغتنم جہاں میں زیارت حسینؑ کی
پہنچائے گی جناں میں محبت حسینؑ کی ہمراہ لے لیا یہ ریاست حسینؑ کی
طے کر کے مشکلوں کے یہ رستے چلے چلو
ہاں گلشنِ بہشت میں ہنستے چلے چلو

اس شان سے جو وارِدِ میداں ہوئے امام کیا رعب حق ہے، کانپ گئی فوجِ روم و شام
نکلا پرے سے جلد بنِ سعد تیرہ فام دکھلاتا ہے امام کو اپنا بھی احتشام
غرہ تھا اس کو تاجِ جواہر نگار پر
چتر زری تھا سایہ فگن نابکار پر

لشکر کو دیکھتا ہوا اپنے وہ سنگدل پہنچا رسالۂ حر غازی کے متصل
دیکھا ہر اک جواں ہے پریشان و مضمحل کوئی جوان غرقِ عرق، کوئی منفعل
ابتر رسالۂ حرِ ذیشاں نظر پڑا
حر دلیر سر بہ گریباں نظر پڑا

جا کر قریب حر کے یہ پوچھا کہ اے جواں رخ سے ترے غبارِ کدورت ہے کیوں عیاں
کیا سانحہ ہے مجھ سے تو کچھ حال کر بیاں کیوں کانپتا ہے، ہونٹوں کو آنسو ہیں کیوں رواں
اپنی نہ ہے خبر، نہ رسالے کا ہوش ہے
یہ کیا سبب جو سر کو جھکائے خموش ہے

رخ ہے اداس، زرد ہے رنگت، تو منہ ہے فق روئیں کھڑے ہیں جسم کے تن ہے عرق عرق
شاید تجھے وطن کی جدائی کا ہے قلق ہوتا ہے تجھ کو دیکھ کے سینہ ہمارا شق

ہو تیرا جب یہ حال تو ہم جنگ کیا کریں
ہاں تو جو مستعد ہو تو شہ سے دغا کریں

بولا یہ حر نہیں مجھے ان میں سے کچھ الم پر تجھ سے کیا کہوں کہ مرے دل کو ہے جو غم
رہ رہ کے مجھ کو دھیان یہ آتا ہے دمبدم مہمان ہو عدو، تو نہ اس پر کرے ستم
میرا ہی سب قصور ہے تیری خطا نہیں
جو رہنما ہو قتل تو اس کا روا نہیں

اور بے خطا ہے وہ، کہ جو ہے کل کا تاجدار سید، غریب، سبطِ رسولِ فلک وقار
شاہِ جلیل، بندۂ مقبولِ کردگار مسجد میں دوشِ خاصِ پیمبرؐ کا شہسوار
نعمت بہشت کی جسے خالق عطا کرے
کیا حال ہوگا ان سے جو کوئی دغا کرے

جھنجھلا کے تب یہ کہنے لگا حر سے وہ لعیں بتلا تو آج کیوں ہے طرف دارِ شاہِ دیں
جا، بر طرف کیا کہ میں اب تجھ سے خوش نہیں سمجھا تھا میں تو دوست، یہ ہے مارِ آستیں
دشمن ہے اس کا، شاہ جو ہے روم و شام کا
عاشق ہے دل سے سبطِ رسولِ انام کا

بولا یہ ہنس کے تب حر غازی بصد وقار ہاں جلد کہہ کہ فوج کے روکیں مجھے سوار
جاتا ہوں سوئے شاہ، خبردار ہوشیار غفلت نہ کر شقی میں اڑاتا ہوں راہوار
صدقے ہے جان سرورِ عالم پناہ کے
ڈھونڈے گی میری خاک بھی دامن کو شاہ کے

یہ کہتے ہیں اڑایا سمندِ صبا مثال بڑھ بڑھ کے روکنے لگے غازی کو بدخصال
رکنا جری کا فوجِ ستم گر سے تھا محال گھوڑا اڑا کہ ہوگئی صرصر بھی پائمال
فوجِ عدو میں رات ہوئی، دن نکل گیا
کافر سقر میں رہ گئے، مومن نکل گیا

گھوڑے اُڑائے جاتے تھے سب بر سرِ فساد اڑتی تھی گرد، دشت میں اُٹھتی تھی گرد باد
مشہور ہے بہار و خزاں میں جو ہے عناد خنداں ہوا دلیر کا لیکن گلِ مراد

فوجِ عدو سے حُر خوش آ میں نکل گیا
باغی پکارتے رہے کلچیں نکل گیا

ناگاہ گوشِ شہ میں یہ آئی صدائے حر　اے بادشاہ خلق کے، مشکلکشائے حر
ہووے جو حکمِ شاہ تو نزدیک آئے حر　آواز فاطمہ نے یہ دی میں فدائے حر
بیٹا نہ ڈر، کریم شہِ مشرقین ہے
بخشے گا سب گناہ کہ رہبر حسین ہے

یہ سن کے جلد گھوڑے سے اترا وہ باوفا　ہاتھوں کو اپنے کھینچ کے رومال سے کسا
سر کو فرو کیے شہ دیں کی طرف چلا　آئی نبیؐ کی سیدِ والا کو یہ صدا
اے میری جان، پاس بلاؤ غلام کو
شبیر، ہاں گلے سے لگاؤ غلام کو

آگے بڑھے یہ دیکھ کے عباس نیک نام　کھولا جری کے ہاتھوں کو باشفقت تمام
کی میہماں نے عرض کہ یا سیدِ انام　کاٹو یہ ہاتھ قابل تعذیر ہے غلام
بھولا نہیں یہ مجرم و خاطی قصور کو
روکا تھا باگ تھام کے میں نے حضور کو

بولا یہ گر کے پاؤں پہ حضرت کے وہ جواں　للہ اِذن دیجئے یا شاہِ انس و جاں
یہ آرزو غلام کی ہے یا شہ زماں　دعوت میں کھاؤں میں تبر و خنجر و سناں
چرچا ہو لشکر عمر سعد زشت میں
پہنچا سبھوں سے پہلے ہراول بہشت میں

غازی نے گر کے پاؤں پہ جب یہ کیے کلام　روئے گلے لگا کے اے شاہِ تشنہ کام
بولے حبیب واہ، زہے شفقتِ امام　آقا پہ ایسے ناز نہ کیوں کر کرے غلام
کی ذرّۂ حقیر پہ شفقت حضور نے
دی کس طرح وغا کی اجازت حضور نے

یہ عرض کر کے واں سے وہ صفدر رواں ہوا　گھوڑے پہ چڑھ کے حر دلاور رواں ہوا
اس آن بان سے وہ غضنفر رواں ہوا　غل تھا فلک پہ، مہر منور رواں ہوا

کیا نور ہے کہ شمس و قمر ماند ہوگئے
نقشِ سُمِ سمند سے سب چاند ہوگئے

یہ شور تھا کہ آن سے پہنچا وہ شیر نر　چلایا بڑھ کے فوج سے ہے کس طرف عمر
کہہ دو کہ نکلے جنگ کو تلوار تول کر　آیا ہوں میں جہاں کو، کردو اسے خبر
گر خود لڑے شقی، تو مزا ہے لڑائی کا
وہ بھی تو لطف دیکھے صفوں کی صفائی کا

میں عبدِ ناتوانِ خدائے جلیل ہوں　جس کے مسیح شاہؑ ہیں، میں وہ علیل ہوں
مشتاقِ کوثر و ارم و سلسبیل ہوں　ہے آرزو کہ راہِ خدا میں قتیل ہوں
اب عزمِ باغِ خلد ہے دل پر ٹھنا ہوا
صدقے میں شاہ کے ہوں بہشتی بنا ہوا

سن سن کے یہ کلامِ فصاحت بیانِ حر　دہشت سے کانپ کانپ گئے، دشمنانِ حر
نکلے دغا کو فوج سے اعدائے جانِ حر　بڑھ بڑھ کے آئے سامنے ایذا رسانِ حر
قبضہ کو حر بھی تیغ کے بس چومتا چلا
لشکر پہ شیرِ نر کی طرح جھومتا چلا

کرنے لگے دلیر پہ جب اہلِ نار وار　کھینچی جری نے میان سے شمشیر آبدار
نکلی عجیب شان سے وہ تیغِ شعلہ بار　ہر سو ہوئے ہوا پہ ستارے سے آشکار
سب فوجِ شام موردِ آفات ہوگئی
خورشید تھرتھرا کے چھپا رات ہوگئی

تھا منتظر اشارہ کا شبدیز خوش جمال　ہر سو طرارے بھرنے لگا صورتِ غزال
جب چٹلیوں کو جھاڑتا تھا وہ صبا مثال　کہتے تھے سب یہ نعل ہیں تو سن کے یا ہلال
کیلیں ہیں یہ کہ گوہرِ تاباں چھپے ہوئے
گویا پری ہے ہاتھ پہ افشاں چُنے ہوئے

حیرت میں تھے لعیں کہ چلی تیغِ آبدار　بجلی سی اک گری کہ چلا اس پہ حر کا وار
کٹنے لگیں جو گردنیں پسپا ہوئے سوار　غل تھا کہ تیغ ہے کہ قیامت ہے آشکار

جامہ ہر اک کے جسم کا صد چاک ہوگیا
تھا جو ہوا پہ جل کے وہ بس خاک ہوگیا

برگِ خزاں سے لوٹتے پھرتے تھے سر کٹے   کیوں کر عدو کا ہاتھ بچے جب سپر کٹے
پھل برچھیوں کے اُڑ گئے تیروں کے سر کٹے   شاخِ کماں کے ساتھ قدوں کے شجر کٹے
بے جاں ہر ایک دشمنِ جاں ہو کے رہ گیا
دم بھر میں باغِ ظلم خزاں ہو کے رہ گیا

چلاتا تھا کوئی کہ مرے تن پہ سر نہیں   کہتا تھا ہاتھ اٹھائے کوئی لو سپر نہیں
شمشیر، گرز و نیزہ و تیر و تبر نہیں   اک حشر ہے پدر کی پسر کو خبر نہیں
کیوں کر نہ کہیے حق کا غضب اس لڑائی کو
بھائی سپر بناتا ہے مقتل میں بھائی کو

ڈھالیں سنبھالتے تھے سیہ کار ہاتھ میں   تھمتی تھی پر نہ ڈھال نہ تلوار ہاتھ میں
گھوڑے چراغ پا ہوئے دوچار ہاتھ میں   الجھی لگامیں پاؤں میں، دستار ہاتھ میں
بیہوش ہوگئے تھے قضا کی خبر نہ تھی
جانوں کے خوف میں سر و پا کی خبر نہ تھی

چمکی کہیں، نگہ سے کہیں دور ہوگئی   وہ تیغ گاہ نار، کبھی نور ہوگئی
یاں بن گئی پری تو وہاں حور ہوگئی   چمکی تو صاف روشنی طور ہوگئی
دستِ قضا وہ تیغ پئے قبضِ روح تھی
گرنے میں برق، اٹھنے میں طوفانِ نوح تھی

کیا سرخ تھا لہو سے رخِ خوں فشانِ تیغ   جوہر نہ تھے، بہار پہ تھا بوستانِ تیغ
کٹ کٹ گئے دراز ہوئی جب زبانِ تیغ   ہر دم تھا اوجِ موج پہ آبِ روانِ تیغ
تکتے تھے جوہروں کو جواں روم و روس کے
مالا تھا موتیوں کا گلے میں عروس کے

پہلے ☆ تھے رن میں حلقۂ جوشن کٹے ہوئے   ٹکرا رہے تھے مغفر آہن کٹے ہوئے

☆ میرے خیال میں یہاں 'پہلے' کی بجائے 'پھلے' ہوگا۔ تصدیق ممکن نہیں ہے۔ (مرتب)

تھے سب نشانِ لشکر دشمن کٹے ہوئے افتادہ تھے سواروں پہ توسن کٹے ہوئے
رخ پھر گئے تھے زیست سے سفاک سیر تھے
انبار تھے تنوں کے تو لاشوں کے ڈھیر تھے

لاکھوں سے لڑکے تھک گیا حر دلیر جب مارا اسے لعیں نے بڑھا کر سمند تب
پے کردیا دلیر کے گھوڑے کو، ہے غضب کودا فرس سے خاک پہ جلدی وہ تشنہ لب
عاجز ہوا نہ شیر ہزاروں سے جنگ میں
پیدل لڑا کیا وہ سواروں سے جنگ میں

یہ حال دیکھتے تھے جو سلطانِ نامدار بس ہوگئے محبتِ مہماں سے بیقرار
اکبر سے بولے، جاؤ وہاں جلد، میں نثار اور ساتھ لو ہماری سواری کا راہوار
پیدل ہے وہ جواں مجھے صدمہ کمال ہے
اب بے حواس فاطمہ زہراؑ کا لال ہے

ہاتھوں سے دل پکڑ کے پکارا، وہ باوقار وقت مدد ہے آیئے یا شاہِ نامدار
نیزہ لگا ہے قلب پہ، سینہ بھی ہے فگار بس اب فقط ہے آپ کے آنے کا انتظار
دنیا سے میہمان کے رخصت کا وقت ہے
تشریف لایئے کہ حمایت کا وقت ہے

آواز آتی دے کے گرا حر خوش خصال سنتے ہی دوڑے اکبرؑ غازی بصد ملال
جھپٹے امام کون و مکاں شیر کی مثال تھے ساتھ ساتھ حضرتِ زینب کے دونوں لال
اس وقت پہنچے شاہ کہ غش وہ غیور تھا
زخموں سے خون بہتا تھا اور جسم چور تھا

زخمِ گلو پہ جب کہ پڑی شاہ کی نظر دیکھا کہ خون بہتا ہے ریتی پہ سر بسر
کپڑے لہو میں جسم کے سب ہوگئے ہیں تر رومالِ فاطمہ تھا جو حضرت کے دوش پر
اس زخم پر اتار کے باندھا حسینؑ نے
بخشا جری کو رتبۂ اعلیٰ حسینؑ نے

اس وقت شاہ سے وہ یہ بولا بحالِ زار مولا میں اس عنایت و اشفاق کے نثار

باندھا ہے کیا گلے پہ یہ، اے شاہِ نامدار بولے یہ حر سے رو کے شہؑ آسماں وقار

واللہ تیغ غم سے جگر چاک چاک ہے

یہ فاطمہؑ کے ہاتھ کا رومالِ پاک ہے

یہ سن کے اس جری نے کہا، یا امامِ پاک یہ حلہ بہشت ہے، میں ایک مشتِ خاک

کیا راحتیں اٹھاتا ہے یہ جسم چاک چاک اے دلبرِ رسولِ زمن، روحنا فداک!

کوثر کی موجیں نور کا عالم دکھاتی ہیں

فردوس میں اشارے سے حوریں بلاتی ہیں

اب اشتیاق اور ہی عالم کا ہے حضور یٰسین پڑھیے، بہرحق اے کبریا کے نور

دم تن سے اب نکلتا ہے یا سرورِ غیور کیجیے بحل انھیں کہ ہوئے ہوئیں جو قصور

ماتھا ہوا ہے تر مرا ٹھنڈے پسینے میں

رک رک کے سانس آتی ہے خادم کے سینے میں

یہ کہہ رہا تھا حر کہ غشی ہوگئی سوا ہچکی کے ساتھ خونِ جگر خاک پر بہا

آنکھیں پھرادیں ہونے لگے سرد دست و پا حسرت سے کی نظر طرفِ شاہِ کربلا

شانہ ہلا جہاں سے سبک دوش ہوگئے

انگلی اٹھاکے کلمے کی خاموش ہوگئے

آئی صدائے حضرتِ محبوبِ کردگار روتا ہوں میہماں کو تمہارے میں دل فگار

مضطر جو مرتضیٰ ہیں، تو شبّر ہیں بے قرار آئی صدائے فاطمہ شبیر ماں نثار!

بیٹا میں حر کے واسطے بیتاب ہوتی ہوں

محسن کی طرح اس کو بھی اے لال روتی ہوں

اتنے میں آئی ڈیوڑھی پہ فضہ بصد الم حضرت کو یوں پکاری کہ یا سید امم

خیمہ میں حر کے واسطے روتے ہیں سب حرم سر پیٹ کہ یہ کہتی ہیں زینب بہ دردو غم

ماں اس کی، نے بہن ہے، تن پاش پاش پر

روئے گی یہ حضور کے مہماں کی لاش پر

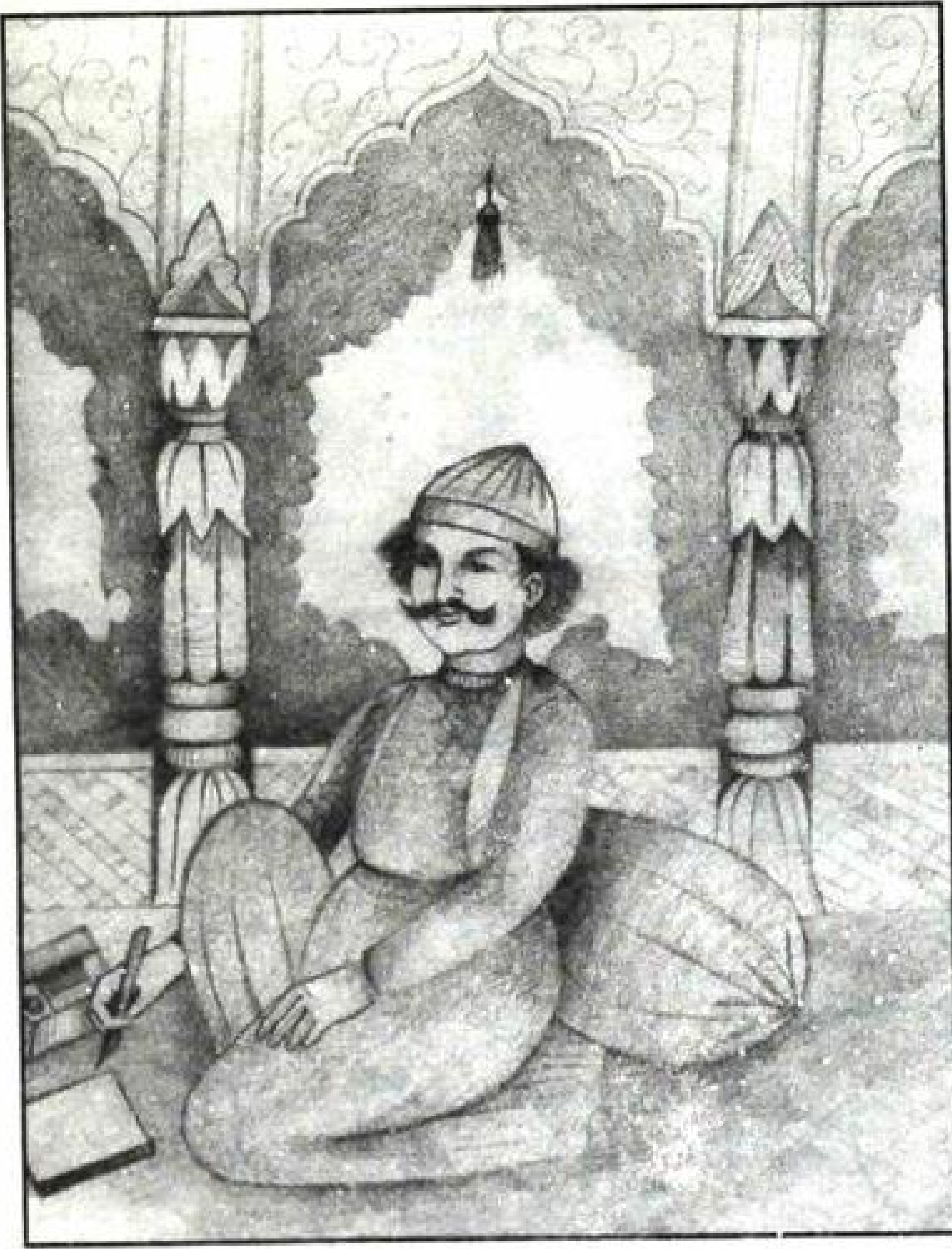
بھائی کا میرے یاور و غم خوار مرگیا آلِ نبی کا آہ، مددگار مرگیا

غازی، دلیر، صفدر و جرار مرگیا مقبولِ عاشقِ شہِ ابرار مرگیا
جو غم ہوا تھا بوذر و سلماں کے واسطے
صدمہ وہی ہوا حُرِ ذیشاں کے واسطے

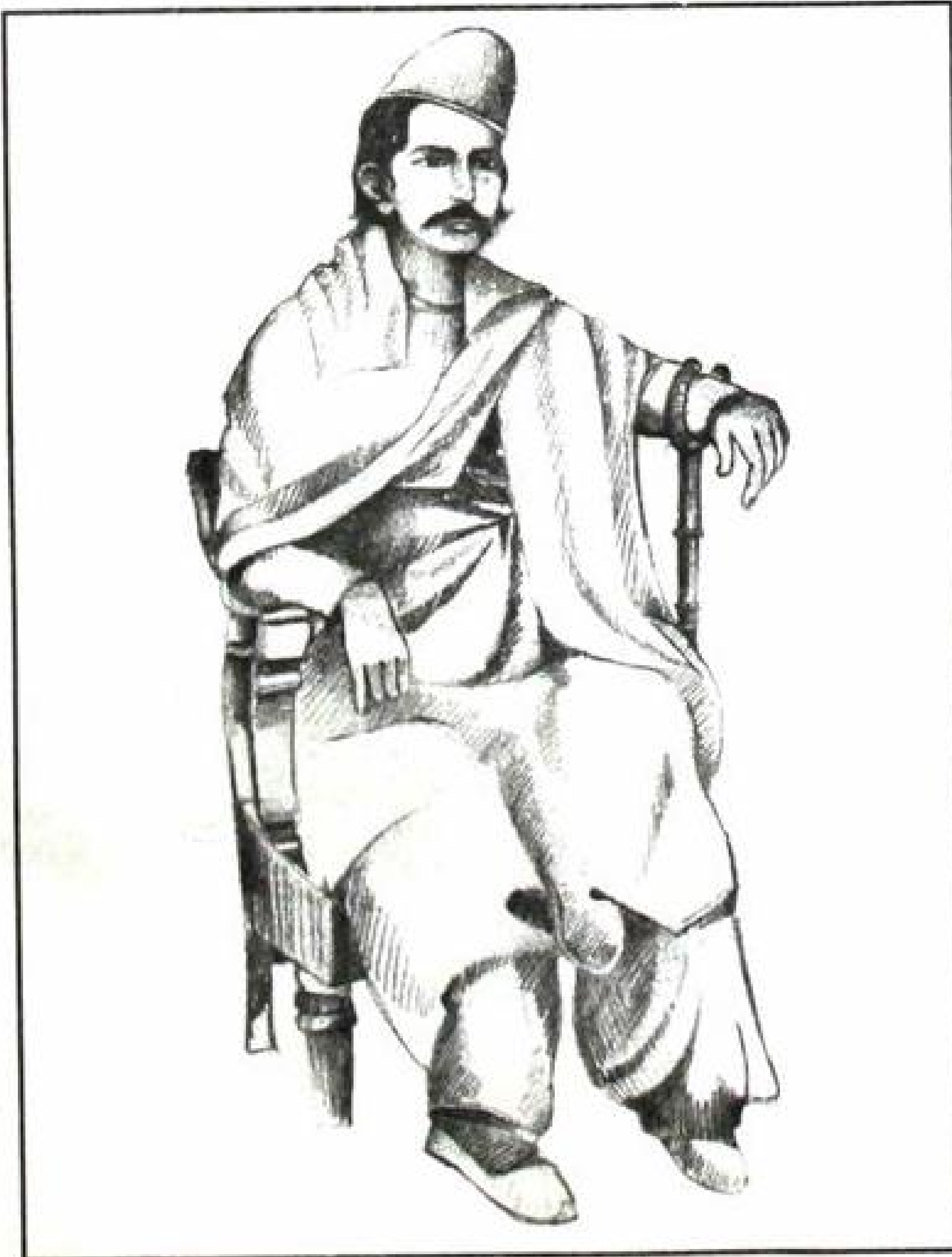
یوں روئیں حر کے واسطے زینب بصد فغاں بیٹے کو جس طرح کبھی روتی ہے کوئی ماں
سر پیٹتی تھی حر کے لیے ساری بیبیاں ڈیوڑھی سے کیا میں لاش کا جانا کروں بیاں
عاشق تھے بادشاہِ غریب الدیار کے
صدقے انیسؔ حر جری کے مزار کے

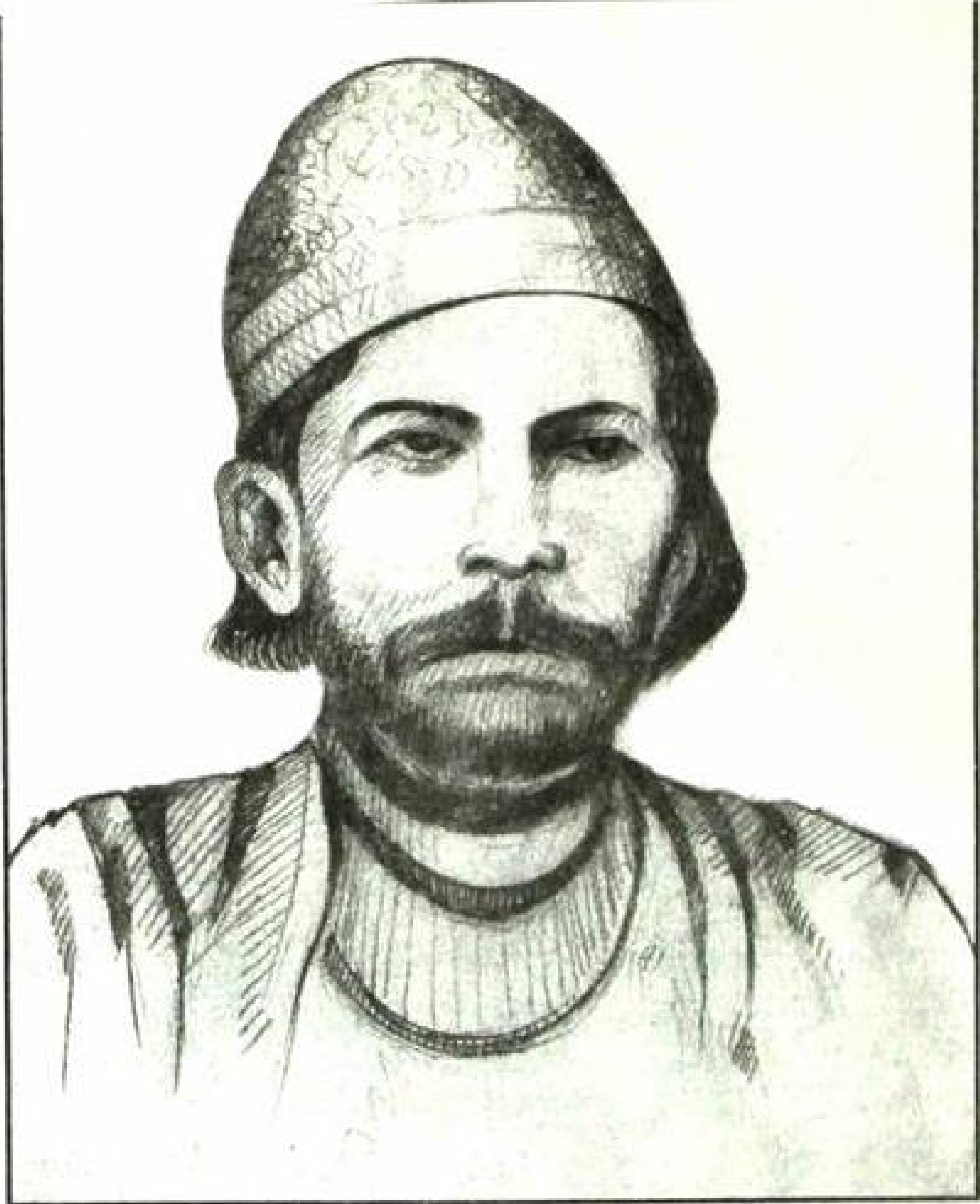
☆☆☆☆

عکسِ تحریرِ میر انیسؔ

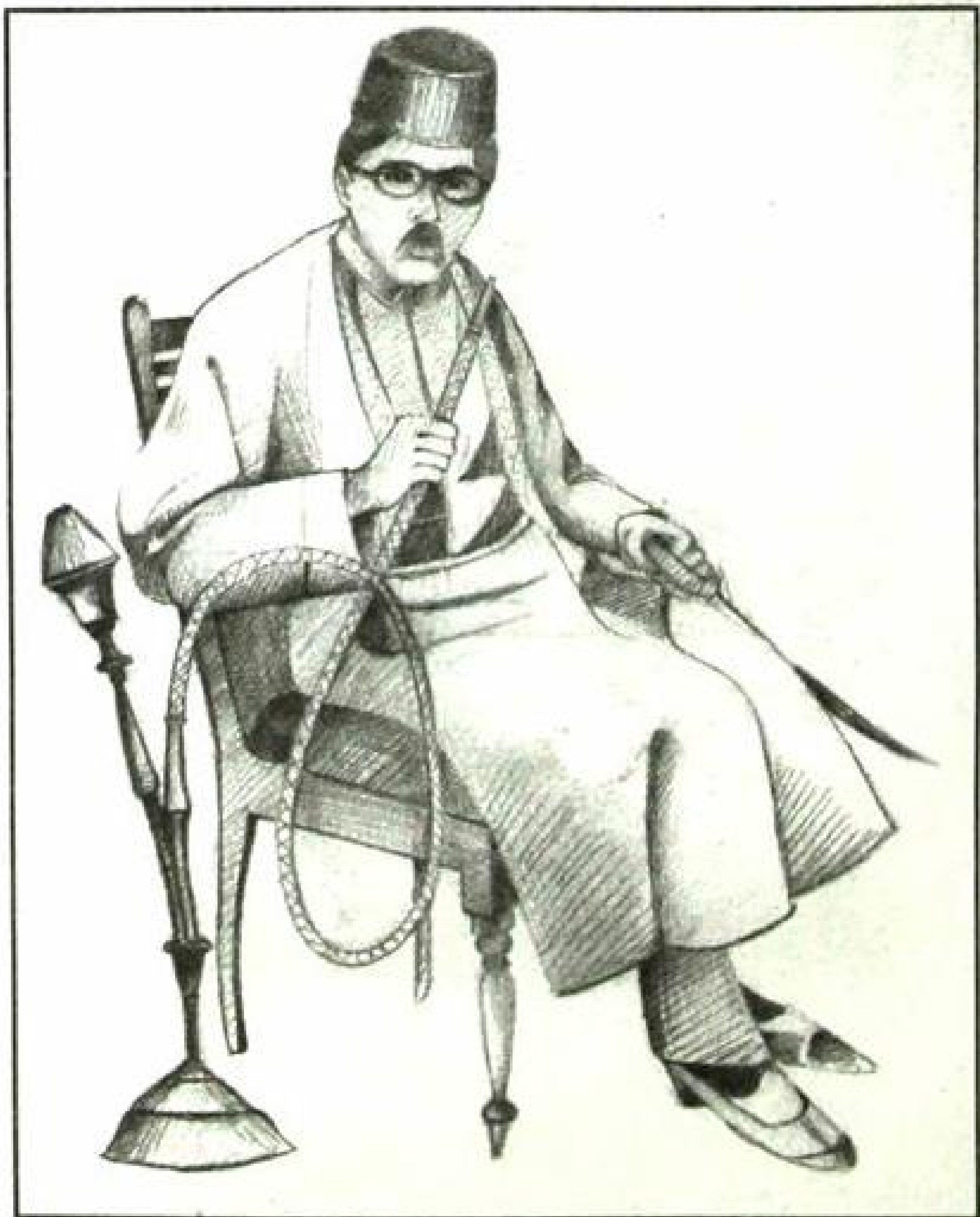


میر حسن (میر انیس کے دادا)





میر نفیس (فرزند میر انیس)



دولھا صاحب عروج (میر انیس کے پوتے)

بند نمبر ۶۳ ، ۶۴ میر انیس کے قلم سے ہے اور بند نمبر ۳۹ ، ۶۲ پر اصلاح بھی انھی کے قلم سے ہے   (مرتضیٰ حسین - فاضل)